کزن

کزن ایک رشتہ ہے۔ ایک پردہ ہے۔
کسی حسینہ کے ساتھ سرعام پکڑے جاؤ
تو کہہ دو، میری کزن ہے۔
لوگ مطمئن ہو جائیں گے اور
قانون معاف کر دے گا۔
لیکن ایک باحیا اور عزت دار لڑکی
کزن کے رشتے کو گناہ نہیں بناتی
سزا بنا دیتی ہے۔

ایسی ہی ایک کزن نے اپنے بدنیت کزن کو
ایسی سزا دی جو قانون کی کتاب میں نہیں ہے۔
عورت کے حجاب میں ہے یا پھر یوم حساب میں ہے۔

میرے گھر والے مجھے اللہ میاں کی گائے کہتے تھے۔ جب میں نے میٹرک کا امتحان اپنے ضلع سے پاس کر لیا تو میری یہی سادگی اور معصومیت مزید تعلیم کے لئے مسئلہ بن گئی۔ گھر میں ہر وقت یہ بحث رہتی کہ میں شہر جا کر کیسے تعلیم حاصل کروں۔ خاص طور پر اماں میری جدائی گوارا نہیں کر سکتی تھیں مگر ابا مجھے ضلع کا ڈی سی دیکھنا چاہتے تھے۔ شہر میں میرے چاچا رہتے تھے۔ اماں کو ان پر بھروسا نہیں تھا۔ کہتی تھی' لاکھ سگے سہی مگر والدین کی طرح خیال نہیں رکھیں گے۔ انہیں دراصل یہ ڈر تھا کہ میں شہر ہی کا ہو کر نہ رہ جاؤں۔ میری سادگی اور احمقانہ شرافت کو شہر کی مکاریاں کھا نہ جائیں۔

ہر ماں یہی چاہتی ہے کہ اس کا بیٹا شادی کے بعد بھی پلو سے بندھا رہے۔ اس کے بیٹے پر بہو کا بھی بھرپور سایہ نہ پڑے لیکن بہو تو ابھی کوسوں دور تھی۔ مسئلہ تعلیم کا تھا۔ ابا مجھے زیادہ سے زیادہ تعلیم دلا کر اعلیٰ سرکاری افسر بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ ان کے انہی بلند حوصلوں نے مجھے شہر کی رنگینیوں میں پہنچا دیا۔

چاچا امام بخش ریلوے میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ ہمارے خاندان میں صرف انہوں نے بی اے تک تعلیم حاصل کی تھی۔ دوسرا میں تھا جو کالج میں داخل ہونے شہر آیا تھا۔ چاچی نے ہمیں دیکھتے ہی خوش ہو کر کہا "بھائی جان' ہمارے گھر میں ایک بیٹے کی کمی تھی' وہ آپ نے پوری کردی۔ میں اسے اتنا پیار دوں گی کہ ہمیں اماں ابا سمجھ کر آپ کو بھول جائے گا۔"

ابا نے ہنستے ہوئے کہا "یہ بات اس کی ماں کے سامنے نہ کہنا۔ ورنہ بواپسی ڈاک سے بیٹے کو بلا لے گی۔"

سب ہنسنے لگے۔ ان کا اپنا بیٹا نہیں تھا۔ صرف ایک بیٹی شاہدہ تھی جو مجھ سے پانچ برس چھوٹی تھی۔ اس لیے میری اہمیت پہلے ہی روز سے اس گھر میں وی آئی پی جیسی ہو گئی تھی۔ ابا مجھے چھوڑ کر اسی شام گاؤں واپس چلے گئے۔

میں نے اپنے ضلع میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کئے تھے اس لئے شہر کے اچھے کالج میں داخلے کے لئے کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ پندرہ بیس دن میں ہی میری نئی زندگی کا سفر

شروع ہو گیا۔ میں نے خود کو انہی اصولوں کا پابند رکھا' جو گاؤں میں تھے۔ کسی اہم وجہ کے بغیر چھٹی کا سوال ہی نہیں تھا اور نہ ہی بعض طلبہ کی طرح آوارگی کی مجھے عادت تھی۔

چاچا اور چاچی دونوں ہی مجھ سے خوش تھے۔ کیونکہ میں شہری ماحول میں پرورش پانے والے لڑکوں سے بہت مختلف تھا۔ صوم و صلواۃ کا پابند۔ میں جب سے ان کے گھر آیا تھا' فجر کی ایک بھی نماز قضا نہیں ہوئی تھی۔ باجماعت نماز کے بعد قرآن کی تلاوت اس کے بعد صبح کی سیر میرے معمولات میں شامل تھے۔ میں اپنی صحت کا خاص خیال رکھتا تھا۔ چاچی ہمیشہ میری اچھی خوراک پر توجہ دیتی تھیں۔ وہ میرے صحت مندانہ طور طریقوں پر قربان ہوتی رہتی تھیں۔ آتے جاتے میری بلائیں لیتی تھیں اور چاچا بھی تعریفی نظروں سے دیکھتے رہتے تھے۔ اگر اپنے منہ میاں مٹھو بننے والی بات نہ ہو تو میں ان کے دعوے کے مطابق لاکھوں میں ایک تھا۔

وہ مجھے کیوں اتنا چاہتے تھے' مجھ پر کیوں قربان ہوتے رہتے تھے میں نہیں جانتا تھا۔ مجھ میں ان دنوں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ کسی کو نظروں سے یا باتوں سے پہچان پاتا۔ ہمیشہ نگاہیں نیچے کئے اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ شاہدہ کے ساتھ ایک ہی چھت کے سائے میں رہنے کے باوجود وہ میرے لئے نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ کبھی سوچتا ہی نہیں تھا کہ وہ ایک جوان لڑکی ہے۔ بچپن سے جو ذہنی پرورش پائی تھی اس کے مطابق وہ صرف چچا زاد بہن نظر آتی تھی۔ وہ بچپن سے شہر میں زندگی گزار رہی تھی لیکن گھر کا ماحول گاؤں جیسا تھا اور زندگی کی شوخیاں اس میں رچی بسی تھیں۔ وہ مجھے تنگ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔ میری سادگی اس کے لئے ایسی تھی جیسے میں جنگل سے آیا ہوں۔ وہ کھیل ہی کھیل میں میرا تماشا بنا دیتی تھی۔ ایک شام چاچا صحن میں بیٹھے ہوئے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ چاچی کھلے کچن میں روٹیاں پکا رہی تھیں اور وہ بھینس کا دودھ دوہ رہی تھی۔ میں نیم کے سائے میں بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس نے مجھے آواز دی "کزن! ذرا دوسرا ڈول پکڑانا' یہ بالٹی بھر گئی ہے۔"

چاچی نے وہیں سے چلا کر کہا "نی شاوہ! اسے تنگ نہ کر۔ خود ہاتھ بڑھا کے پکڑ لے۔ ڈول کون سا دور ہے؟"

میں ڈول لے کر اس کے پاس آ گیا۔ اس نے ترچھی نظروں سے دیکھا' مسکرائی پھر ڈول پکڑتے ہوئے بولی "کھڑے کیا ہو۔ جھک کر بالٹی ہٹاؤ۔ پھر میں یہ خالی ڈول رکھوں گی۔"

اس نے دوپٹے کو سر کے چاروں طرف یوں باندھ رکھا تھا جیسے سر میں درد ہو۔ کھلے گریبان کا کرتا پہنے ہوئے تھی۔ میں اس کے کہنے پر ذرا سا جھک گیا۔ جھکتے ہی مجھے کچھ نظر آیا۔ نظر آنا اور بات ہے سمجھ میں آنا اور بات ہے میرا ذہن اتنا معصوم تھا کہ میری آنکھیں فوراً" ہی زاویہ بدل کر بھینس کے تھن کو دیکھنے لگیں۔ اسی وقت شاہدہ نے تھن سے نکلنے والی دودھ کی دھار میرے منہ کی طرف کر دی۔ میں بوکھلا گیا۔ فوراً" ہی پیچھے

ہٹ سکا- کچھ دودھ آنکھوں میں گیا کچھ میرے کھلے ہوئے منہ میں- باقی چہرہ دودھیا گیا- وہ زور زور سے ہنسنے لگی- چاچا بھی اس کی چھیڑ خانی پر مسکرانے لگے- چاچی نے غصے سے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "تو میرے پتر کا مذاق اڑاتی ہے-"

وہ ہنستے ہوئے بولی "امی! کبھی اس کی ماں نے دعائیں دی ہوں گی دودھوں نہاؤ اور پوتوں پھلو- آج میں نے آدھی دعا پوری کر دی ہے-"

اس بات پر سب ہنسنے لگے- چاچا نے مجھ سے کہا "پتر! بھائی جان اور بھابی جان نے تجھے مٹی کا مادھو بنا کر رکھا ہے- ارے گھر میں مذاق کا جواب مذاق نے نہیں دیتا' کالج میں کیا کرتا ہو گا؟ لڑکے تیرا مذاق اڑاتے ہوں گے-"

"یہ بات نہیں ہے چاچا! میں اینٹ کا جواب پتھر سے دینا جانتا ہوں- یہ تو اپنے گھر کی بات ہے- یہ مذاق کر کے خوش ہو جاتی ہے- میں اس کا دل رکھ لیتا ہوں-"

چاچی نے کہا "ہرگز نہیں' یہ ایک کہے تو دس سنایا کر- یہ مذاق کرے تو تو بھی منہ توڑ جواب دیا کر-"

میں نے کہا "چاچی! آپ اجازت دیتی ہیں تو یہ لیجئے-"

یہ کہتے ہوئے میں نے شاہدہ کے سر سے بندھا ہوا دوپٹہ ایک جھٹکے سے کھینچا- وہ گرتے گرتے بچی- پھر میں نے اس کے دوپٹے سے اپنے چہرے کے سارے دودھ کو پونچھا- وہ مسکرا کر دیکھ رہی تھی- میں نے اپنی چپل میں سے ایک پیر نکال کر اس پیر کو بھی دوپٹے سے پونچھا- وہ ایسے غصے سے دیکھ رہی تھی جس میں ہلکی سی مسکراہٹ بھی تھی- پھر میں نے اس دوپٹے کو اس کی گود میں پھینک دیا- چپل پہن کر چاچی سے بولا "کیوں چاچی! کیسی رہی؟"

"اچھی رہی- اسے ڈھیل دے گا تو یہ ناک میں دم کرتی رہے گی- اس کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا کر-"

کچھ باتیں کچھ گھاتیں سمجھنے کے لئے ہوتی ہیں- استاد آ کر نہیں سمجھاتا ہے لیکن میں تو پنڈ سے لے کر یہاں تک استادوں کے ذریعے ہی ہر بات سمجھتا آیا تھا- اس لئے یہ جان نہ پایا کہ چاچا اور چاچی ہم دونوں کو یونہی گھلتے ملتے دیکھنا چاہتے تھے-

گرمی کے دن تھے- دن کے وقت لو چلتی تھی- رات کو حبس ہوتا تھا- ہم سب چھت پر سویا کرتے تھے لیکن شام ہی سے اچانک بارش ہونے لگی- چاچا نے جو بڑی سی کوٹھی بنوائی تھی اس میں ایک ڈرائنگ روم اور چار بیڈ روم تھے- ہم سب کے لئے ایک ایک کمرا وقف تھا- راہداری کے ایک طرف میرا کمرا تھا اور دوسری طرف شاہدہ کا- یوں ہم ایک دوسرے کے آمنے سامنے رہتے تھے- وہ کوئی سستے خیالات اور جذبات والی لڑکی نہیں تھی- بہت ریزرو رہتی تھی- شاید بچپن سے اپنے والدین کی زبانی سنتی آئی ہو گی کہ اس کا رشتہ مجھ سے ہو جائے گا' چودھرائن بن کر لاکھوں کروڑوں میں کھیلے گی پھر آپس میں سب

دیکھے بھالے ہیں یہ اندیشہ نہیں رہے گا کہ سسرال جا کر بیٹی کی قسمت پھوٹنے والی ہے- ماں باپ اپنی بیٹی کی بھلائی چاہتے ہیں- چاچا اور چاچی بھی تہذیب کے دائرے میں رہ کر ہمیں ایک حد تک آزادی دیتے تھے اور ہم پر کڑی نظر بھی رکھتے تھے- پھر یہ کہ انہیں اپنی بیٹی پر پورا اعتماد تھا اور میری معصومیت اور شرافت کے تو وہ معتقد ہو چکے تھے- بہرحال میں کہہ رہا تھا کہ شاہدہ نے مجھ میں یہ خوبیاں دیکھی تھیں- مجھے پسند کیا تھا- اسی لئے میری طرف مائل ہوتی جا رہی تھی- اس رات میں اپنے کمرے میں میز کے پاس بیٹھا پڑھ رہا تھا راہداری کی دوسری طرف اس کے کمرے کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا- وہ کبھی ادھر کبھی ادھر آتی جاتی رہتی تھی- کبھی کوئی چیز گرا کر مجھے اپنے کمرے کی طرف دیکھنے پر مجبور کرتی تھی-

ایک بار میں نے ادھر دیکھا- وہ ایک چھوٹا سا آئینہ پکڑے اپنے ہونٹوں پر لپ اسٹک لگا رہی تھی- میں پھر کتاب پر جھک گیا سوچنے لگا یہ اتنی رات کو سرخی کیوں لگا رہی ہے؟

پھر میں نے سوچا یہ دن کو سرخی لگائے یا رات کو میری' بلا سے' مجھے پڑھنے میں دل لگانا چاہئے- میں پڑھنے لگا مگر حروف آپس میں گڈمڈ ہونے لگے- کتاب کے صفحے پر وہ آئینہ دیکھ کر سرخی لگاتی ہوئی دکھائی دی- میں نے جھنجلا کر پھر اس کمرے کی طرف دیکھا اب اس کے ہاتھ میں آئینہ نہیں تھا- ململ کا سفید دوپٹہ تھا- وہ اس دوپٹے کو اپنی کھلی ہوئی ہتھیلیوں پر رکھ کر اس پر جھک رہی تھی- اسے چومنے والی تھی- میں نے تجسس سے دیکھا وہ آخر کیا کر رہی ہے؟

اس نے اپنے سرخ ہونٹ اس ململ کے دوپٹے پر رکھ دیے- میں میز کے پاس سے اٹھ کر دروازے پر آیا- پھر دھیمی آواز میں بولا "اے! یہ کیا حماقت ہے- دوپٹے پر دھبا کیوں لگا رہی ہو؟"

وہ پیر پٹختی ہوئی اپنے کمرے سے نکل کر میرے دروازے پر آئی- پھر میرے ہاتھ میں اپنا دوپٹہ رکھتے ہوئے بولی "دھبا تو تم نے لگایا ہے- اپنے پاؤں کی مٹی پونچھی تھی- وہ مٹی ابھی تک لگی ہوئی ہے-"

تب مجھے یاد آیا کہ یہ وہی دوپٹہ ہے جس سے میں نے پہلے چہرے کو پھر پاؤں کو پونچھا تھا- میرے پاؤں کی مٹی ابھی تک اس دوپٹے پر لگی ہوئی تھی لیکن جہاں مٹی لگی تھی وہی ہونٹوں کے سرخ نشان پڑے ہوئے تھے- کوئی یقین نہیں کرے گا کہ میں اتنا بھولا تھا کہ اب بھی کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا- میں نے اس سے کہا- "یہ کون سی عقل مندی ہے' میں نے تھوڑی سی مٹی لگائی تو تم نے سرخ دھبا لگا دیا- توبہ توبہ' تمہارے ہونٹوں پر بھی مٹی لگی ہو گی- تم بہت گندی ہو-"

اس نے بڑے دکھ سے مجھے دیکھا- اس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ میں اس کے لبوں کی سرخی کو دھبا کہہ رہا ہوں- کوئی عقیدت سے محبوب کے نقش پا پر چلتا ہے- اس نے محبت سے میرے خاک پا پر ہونٹ رکھ دیے تھے اور میں اسے غلیظ کہہ رہا تھا- حسن

غلاظت کا خیال کرتا تو کیچڑ میں نہ کھلتا- یہ باتیں اب سمجھ رہا ہوں- ان دنوں ان معاملات میں عقل سے پیدل تھا-

وہ بولی "میں کچھ نہیں جانتی- تم نے دھبا لگایا ہے- اسے ابھی مجھے دھو کر دو-"

میں نے کہا "ابھی ضروری نہیں ہے- کل صبح دھو کر دوں گا-"

"کیا امی اور ابا سے مار کھلاؤ گے- وہ سو رہے ہیں اس لئے ابھی جاؤ اور اسے دھو کر لاؤ-"

"ایک تو تم نے پہلے شرارت کی- شرارت کا جواب میں نے دیا تو یہ دوپٹہ دھلوانا چاہتی ہو- کوئی بات نہیں' یہاں ٹھہرو ابھی دھو کر لاتا ہوں-"

میں پلٹ کر اپنے کمرے کے اٹیچ باتھ روم میں جانا چاہتا تھا- اس نے ایک جھٹکے سے دوپٹے کو چھین لیا پھر مسکرا کر کہا "خدا کی قسم' اتنا دھلا ہوا صاف اور شفاف ذہن شاید ہی کہیں دیکھنے میں آتا ہو-"

یہ کہتے ہی وہ اپنا دوپٹہ لے کر کمرے میں گئی- پھر دروازے کو بند کر لیا میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تعلیم حاصل کرنے شہر آؤں گا تو کالج کے علاوہ بھی کئی نادیدہ درس گاہیں ملیں گی جہاں ایسے سبق پڑھائے جائیں گے جو ابتداء میں میری سمجھ میں نہیں آئیں گے- پھر نا سمجھی میں رفتہ رفتہ سمجھتا چلا جاؤں گا-

جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے کالج میں کچھ اوباش قسم کے لڑکے بھی ہوتے ہیں- یہ اکثر امیر گھرانوں سے آتے ہیں- انہیں تعلیم سے دلچسپی نہیں ہوتی- یہ سیاست کے لئے آتے ہیں یا لڑکیوں کی صحت دیکھنے کے لئے- انہیں حسن کی دھوپ میں آنکھیں سینکنے کا مزہ آتا ہے یہ ایسے ہی مزے کے لئے کالج آتے جاتے ہیں-

میرے کالج میں قاسم' ریاض' اسلم اور محمود ایسے طلبا تھے' جن کی شرارتوں پر کبھی ہنسی آتی تھی اور کبھی غصہ- جب وہ کسی لڑکی پر فقرہ کستے تھے' کسی کے قریب سے ستا سا شعر سنا کر گزرتے تو مجھے غصہ آتا تھا- جو طالبہ سیدھی ہوتی تھی' وہ تلملا کر رہ جاتی تھی' جو ٹیڑھی ہوتی تھی' اسے وہ چاروں یاد رکھتے تھے اور اس سے کترا کر گزر جاتے تھے-

انہوں نے ابتداء میں مجھے نظر انداز کیا- پھر انہیں معلوم ہوا کہ میں بہت بڑے زمیندار کا بیٹا ہوں اور ان کی طرح اونچے طبقے سے تعلق رکھتا ہوں' تو وہ مجھ سے باتیں کرنے اور بے تکلف ہونے لگے- کلاس میں میرے آس پاس آ کر بیٹھنے لگے- تب میں نے کہا "پروفیسر کے لیکچر کے وقت باتیں نہ کیا کرو- میں یہاں صرف پڑھنے آتا ہوں- دوستی کرنی ہو گی تو کالج کے باہر دنیا پڑی ہے-"

ایک روز میں سائنس کے پریکٹیکل کے لئے لیبارٹری جا رہا تھا- وہ چاروں نظر آئے- لیبارٹری کے دروازے پر قاسم نے راستہ روک لیا- میں نے پوچھا "یہ کیا حرکت ہے؟"

اس نے کہا "یار! تم ہم سے دوستی نہیں کرتے' نہ سہی- کوئی زبردستی نہیں ہے لیکن

کسی اور کا تو دل نہ توڑو-"

"میں کس کا دل توڑ رہا ہوں؟"

محمود نے قریب آ کر کہا "کمال ہے- کسی پر قیامت گزر رہی ہے اور تمہیں خبر نہیں ہے-"

"کس پر قیامت گزر رہی ہے؟ بات صاف صاف کرو"

"وہ صاف صاف نظروں سے تمہیں دیکھتی رہتی ہے اور تم نظریں چرا کر گزر جاتے ہو-"

"میں کسی سے نظریں نہیں چراتا- مجھ سے ایسی باتیں نہ کیا کرو- کسی لڑکی کو بدنام کرنا اچھی بات نہیں ہے-"

"بدنامی تو اس وقت ہوتی ہے جب کسی کی مرضی کے خلاف اس کا نام اپنے نام کے ساتھ لگایا جائے- یہاں بدنامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا- وہ لڑکی خود ہی تم سے راضی ہے-"

میں نے حیرانی سے پوچھا "تم کس کی باتیں کر رہے ہو؟"

"بھئی شاہدہ کی بات کر رہا ہوں- وہ تو گھر سے پڑھنے نہیں تمہیں دیکھنے آتی ہے-"

میرا دماغ ایک دم سے گرم ہو گیا- میں نے یکبارگی اس کا گریبان پکڑا- اسے جھنجھوڑا پھر اسے رگیدتا ہوا ایک دیوار سے جا کر لگا دیا- اس کا گلا دبوچ کر بولا "تم میری بہن کو بدنام کر رہے ہو- اتنے کمینے ہو کہ مجھے اس کے ساتھ بدنام کر رہے ہو- میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا-"

اس کے تینوں ساتھیوں نے مجھے تین طرف سے پکڑ کر پوری قوت سے الگ کرتے ہوئے کہا "بھائی معاف کرو- ہمیں کیا معلوم تھا کہ وہ تمہاری بہن ہے-"

قاسم نے کہا "نہ تم کبھی شاہدہ کے ساتھ آئے نہ شاہدہ نے بتایا کہ تم اس کے بھائی ہو-"

ریاض نے کہا "یارو! میں اچھی طرح جانتا ہوں- اس کا کوئی بھائی کا نہیں ہے-"

میں نے کہا "ہم سگے نہیں ہیں- وہ میرے چاچا کی بیٹی ہے-"

وہ چاروں ہنسنے لگے- ایک نے کہا "تو یوں کہو نا کہ وہ تمہاری کزن ہے- یار تم نے تو ڈرا ہی دیا- اسے بہن کہہ کر ہم پر چڑھ دوڑے-"

میں نے چونک کر کہا "لیکن شاہدہ تو کالج میں نہیں پڑھتی ہے- اس نے میٹرک کے بعد تعلیم چھوڑ دی ہے- اب گھر میں رہا کرتی ہے- تم لوگ کس شاہدہ کی بات کر رہے ہو؟"

چاروں نے مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا- پھر سب کے سب ہنسنے لگے- ریاض نے میرے شانے پر ہاتھ مار کر کہا "واہ رے بھولے بادشاہ! اتنی دیر سے ہمیں بھی چکر میں ڈال

رکھا تھا۔"

اسلم نے کہا "چلو یہ بات صاف ہو گئی کہ ہمارے کالج والی شاہدہ تمہاری بہن وہن کزن وزن نہیں ہے۔"

محمود نے میرے کسرتی بدن پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "کیا قد ہے اور کیا باڈی ہے۔ سپرمین لگتے ہو۔ اسی لئے لڑکیاں تم پر مرتی ہیں ......"

میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے آگے کچھ کہنے سے روکتے ہوئے کہا "پلیز! ابھی میں نے جو زیادتی تم سے کی ہے اس کی معافی چاہتا ہوں اور التجا کرتا ہوں کہ میرے سامنے لڑکیوں کا ذکر نہ کیا کرو۔ مجھے ایسی باتوں سے دلچسپی نہیں ہے؟"

"سچ کہہ رہا ہوں۔ میری محبت علم سے ہے۔ میری محبوبہ کتابیں ہیں۔ شاید میں نے یہاں کسی شاہدہ کو دیکھا ہو لیکن اسے نہیں پہچانتا ہوں اور نہ ہی پہچاننا چاہتا ہوں۔"

"لیکن اس بے چاری کا کیا بنے گا؟"

"اس سے تمہاری باتیں ہوتی ہوں تو سمجھا دینا۔ مجھے تعلیمی ادارے میں بدنام نہ کرے۔"

ایک نے ہنستے ہوئے کہا "کسی لڑکی سے لڑکا بدنام ہوتا ہے' یہ آج سنا ہے۔"

میں نے کہا "میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ اسے یہ بھی سمجھا دینا' وہ میری بدنامی کا باعث بنے گی تو میں پرنسپل صاحب سے شکایت کر دوں گا۔"

"پرنسپل صاحب سے؟" وہ چاروں ہنسنے لگے "بھئی کمال ہو گیا۔ پرنسپل صاحب سے ایک لڑکی کی شکایت کرو گے؟ بھئی مزہ آ گیا۔"

وہ چاروں ہنستے ہنستے گھاس پر گر کر لوٹنے لگے' ایک نے کہا۔ "اوہ گاڈ! یہ تو نے کیا نمونہ بھیجا ہے۔ ہم نے اب تک یہی دکھا ہے کہ لڑکیاں پرنسپل کے پاس جا کر لڑکوں کی شکایت کرتی ہیں۔"

دوسرے نے کہا "فلموں میں بھی یہی دیکھتے ہیں مگر یہ دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہے۔ ایک لڑکی کے خلاف دہائی دینے پرنسپل کے پاس جائے گا۔"

یہ ہنسنے کی بات نہیں تھی' سمجھنے کی بات تھی مگر وہ اپنے مزاج کے مطابق میرا مذاق اڑا رہے تھے۔ میرے پاس ان سے بحث کرنے یا الجھنے کا وقت نہیں تھا۔ پریکٹیکل کا وقت ہو گیا تھا۔ میں لیبارٹری میں چلا گیا۔

دوسرے دن کالج کے احاطے میں داخل ہوا تو ایک دیوار کی طرف دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ ایک بڑا سا کاغذ دیوار پر چپکا ہوا تھا۔ اس پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔ "اے لڑکی! تجھے چھیڑتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ تیرا کوئی باپ بھائی نہیں ہے۔"

میں نے اسے پڑھ کر زیر لب کہا "کیا بے ہودہ مذاق ہے۔"

میں آگے بڑھ گیا۔ یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ تحریر مجھ سے ہی تعلق رکھتی ہے۔

آگے جا کر ایک اور دیوار پر ویسا ہی کاغذ چپکا ہوا تھا جس پر لکھا ہوا تھا "اے خبردار! مجھے چھیڑو گی تو پرنسپل سے شکایت کردوں گا۔"

یہ پڑھتے ہی میں سٹپٹایا۔ بات سمجھ میں آ گئی۔ ان چاروں نے پچھلے دن پرنسپل کے حوالے سے میرا مذاق اڑایا تھا۔ میرے جی میں آیا کہ پھر ان میں سے ہر ایک کا گریبان پکڑوں اور ان کی خوب پٹائی کروں لیکن عقل نے سمجھایا۔ میں یہ ثابت نہیں کر سکوں گا کہ وہ سب میرے ہی خلاف لکھا گیا ہے۔

کمبختوں نے ہر جگہ دیواروں پر کچھ نہ کچھ لکھ رکھا تھا۔ لڑکیاں پڑھ پڑھ کر ہنس رہی تھیں۔ کالج کے برآمدے میں ایک طالب علم نے مجھے روک کر پوچھا "یہ سب کس نے لکھا ہے؟ کس کے لئے لکھا ہے؟"

میں نے ناگواری سے جواب دیا "میں نہیں جانتا۔ جس نے لکھا ہے اس سے پوچھو۔"

میں تیزی سے چلتا ہوا کلاس روم میں آیا۔ وہاں بھی دو تین لڑکوں نے یہ سوال کیا "آخر وہ کون ہے جس سے یہ تحریریں منسوب کی گئی ہیں؟"

میں نے جھنجلا کر کہا "تم لوگ مجھ سے ہی کیوں پوچھ رہے ہو؟" کیا لکھنے والوں نے مجھے بتا کر لکھا ہے؟"

وہ مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ میں تیزی سے چلتا ہوا اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا میرے ڈیسک پر ایک تہ کیا ہوا کاغذ رکھا تھا۔ میں نے سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا پھر اٹھا کر کھولا' اس میں لکھا تھا۔

سوال "چچا کی بیٹی کو کیا کہا جاتا ہے؟"

جواب "چچا کی بیٹی بچپن میں بہن اور جوانی میں کزن ہوتی ہے۔"

سوال "کیا کزن سے شادی ہوتی ہے؟"

جواب "صرف شادی نہیں ہوتی' عشق بھی ہوتا ہے؟"

سوال "عاشق کو دوسرے کا گریبان پکڑنا چاہئے یا دیوانگی میں اپنا گریبان چاک کرنا چاہئے؟"

جواب "جو کزن کے لئے اپنا گریبان چاک نہیں کرتا' وہ نہ تو عاشق ہے' نہ دیوانہ۔ وہ صرف اور صرف گدھا ہے۔"

میں نے غصے سے اس کاغذ کو مٹھی میں بھینچ لیا۔ پروفیسر صاحب کلاس میں آئے تو میں نے ان کے پاس جا کر وہ تحریر دکھائی اور کہا "اس قسم کی باتیں دیواروں پر بھی لکھ کر مجھے پریشان کیا جا رہا ہے۔"

انہوں نے اس کاغذ کی تحریر پڑھی۔ اسے تہ کرتے ہوئے مجھے دیکھا پھر اسے میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے پوچھا "اس میں کہاں لکھا ہوا ہے کہ تم اسے پڑھ کر پریشان ہو جاؤ اور یہ بھی نہیں لکھا ہے کہ یہ تمہارے لئے ہے۔"

"سر! کسی نے اسے میرے ڈیسک پر رکھا تھا۔"

"تم دوسرے کے ڈیسک پر رکھ دو۔ دوسرا کسی تیسرے کے ڈیسک پر رکھ دے گا۔ درس گاہ میں بیٹھ کر اسے علم سمجھو تو یہ تم سب کے لئے ہے۔ پوری کتاب ہو یا ایک صفحے کی تحریر ہو، وہ آگہی کے لئے ہوتی ہے۔ کسی بھی تحریر کو ہر شخص اپنے نقطہ نظر سے پڑھتا اور سمجھتا ہے۔ تم اس کی اچھی باتوں کو یاد رکھو اور جو گراں گزرتی ہیں اسے چھوڑ دو۔"

"سر! اس میں اچھی باتیں کیا ہیں"

"اچھی باتیں سمجھنے کی سمجھ رکھو۔ اس میں چچا کی بیٹی کے متعلق لکھا ہے۔ ہمارے دین میں کہا گیا ہے کہ پہلے آپس میں رشتے داری کرو۔ خاندان میں ماموں زاد، خالہ زاد، پھوپی زاد اور چچا زاد ہو تو ان میں سے کسی سے رشتہ کرو۔ کیونکہ یہ رشتے زیادہ قریب اور جانے پہچانے ہوتے ہیں۔"

"سر! آپ نے بات کو کہاں سے کہاں گھما دیا ہے۔"

"علم بہت گھوم پھر کر حاصل ہوتا ہے۔ جستجو کے بغیر معنی و مفہوم کی دنیا سامنے نہیں آتی۔ اسے پڑھ کر فراخ دلی سے مسکراؤ گے تو لکھنے والا شرمندہ ہو جائے گا۔ تم ایک کم ظرف سے ملتے رہو اور اس کی تمام بری عادتیں چھوڑتے رہو تو تم میں اعلیٰ ظرفی پیدا ہوتی رہے گی۔ ایک کم ظرف بھی استاد ہوتا ہے اگر اس سے کچھ سیکھنا چاہو۔"

"شکریہ سر! آپ نے مجھے سوچنے سمجھنے کا ایک نیا انداز دیا ہے۔"

میں اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ اسی وقت قاسم، اسلم، ریاض اور محمود نے کلاس کے دروازے پر آکر پوچھا "سر! کیا ہم آسکتے ہیں؟"

میں نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ان پر غصہ نہیں آیا۔ اتنی فراخ دلی بھی نہیں آئی تھی کہ مسکرا دیتا۔ ویسے صبر کرنا آ گیا تھا۔ پروفیسر نے ان سے کہا "آ جاؤ۔ تم چاروں ایک ساتھ آتے ہو، ایک ساتھ لیٹ ہوتے ہو اور یہ تم لوگوں کے لئے فخر کی بات ہے کہ کسی بھی معاملے میں ایک ساتھ بدنام ہوتے ہو۔"

وہ میرے آس پاس کی خالی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ قاسم نے میرے قریب جھکتے ہوئے آہستگی سے کہا "راستے میں کار کا ایک پہیہ پنکچر ہو گیا تھا۔ اسے بدلنے میں دیر ہو گئی۔"

میں خاموش رہا۔ لیکچر سنتا رہا لیکن یہ سوچتا رہا کہ یہ چاروں ابھی کالج میں آئے ہیں۔ پر وہ نوشتہ دیوار اور کاغذ کی یہ تحریر کس کی شرارت ہے؟

شرارت کسی کی بھی ہو۔ وہ لیٹ آ کر الزام سے بری ہو گئے تھے۔ انہیں غصہ دکھانا، ہوا کو پتھر مارنے کے مترادف تھا۔

میں موٹر سائیکل پر گھر سے کالج آتا جاتا تھا۔ ابا اور چاچا نے کئی بار کہا کہ میں ایک چھوٹی سی کار خرید لوں لیکن دوسرے نوجوانوں کو موٹر سائیکل تیزی اور اسٹائل سے چلاتے دیکھ کر شوق پیدا ہوا کہ میں بھی اسی طرح کالج آتا جاتا رہوں۔ اس روز کالج سے گھر پہنچا تو

موٹر سائیکل سے اترتے وقت خیال آیا۔ ڈیسک پر ملنے والا تہ کیا ہوا کاغذ میری جیب میں اب تک ہے۔ میں نے سوچا تھا۔ کالج سے نکلتے ہی اس کے پرزے پرزے کر کے ہوا میں منتشر کر دوں گا لیکن بھول گیا تھا۔

میں نے شاہدہ کو کبھی کسی اور نظر سے نہیں دیکھا تھا لیکن جیب میں رکھا ہوا کاغذ بہن اور کزن کا فرق سمجھا رہا تھا۔ کوئی موہوم سی ترغیب دے رہا تھا۔ ایک چور سا خیال تھا کہ اسے شاہدہ نے پڑھ لیا تو کیا سوچے گی؟ اور سوچے گی تو کہاں تک پہنچے گی؟ چاچا چاچی میرے متعلق کیا رائے قائم کریں گے؟

جب سوچ کا یہ سلسلہ شروع ہو کہ اب کیا ہوگا؟ کوئی کیا سوچے گا؟ دنیا کیا کہے گی؟ تو اسی اسرار اور تجسس کے تحت بندہ معصومیت کے خول سے نکلنے لگتا ہے۔ ایسی آگہی کے دروازے کھلنے لگتے ہیں جو نامعلوم ہوتی ہے اور معلوم ہوتی جاتی ہے۔

فی الحال یہ سمجھ میں آیا کہ جیب میں رکھی ہوئی تحریر کو فوراً جلا دوں۔ اس پر کسی کی نظر نہ پڑے۔ ایسا چور سوچتے ہیں کہ ہم پر کسی کی نظر نہ پڑے جبکہ میں نے چوری نہیں کی تھی۔ وہ بہن اور کزن والی بات میں نے نہیں لکھی تھی۔ لیکن شاہدہ کے حوالے سے یہی سمجھا جاتا کہ میں نے اس کی عاشقی اور دیوانگی میں وہ باتیں لکھی ہیں۔

میں تیزی سے چلتا ہوا اندر آیا۔ کاریڈور سے گزر کر اپنے کمرے میں پہنچا۔ وہاں کتابیں رکھیں، جوتے اور جرابیں اتاریں پھر چپل پہن کر کچن میں آیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے کوٹ کی جیب سے تہ کیا ہوا کاغذ نکالا۔ سوچا کہ اسے کھول کر پھر ایک بار پڑھوں لیکن پڑھنے کے خیال سے ایسا لگا جیسے میں شاہدہ کو پڑھنے جا رہا ہوں۔ میں نے فوراً ہی دیا سلائی کی ڈبیا اٹھائی۔ ایک تیلی نکالی پھر اسے سلگا کر اس کاغذ کو آگ لگا دی۔

کاغذ جلنے لگا میں نے اسے ایک چٹکی میں پکڑا ہوا تھا۔ اسے پورا کا پورا جلا دینا چاہتا تھا۔ اس کی آنچ میری انگلیوں اور ہتھیلی تک پہنچ رہی تھی لیکن وہ تحریر نہیں جل سکتی تھی کیونکہ جلانے سے پہلے ہی اس کی آنچ میرے چور ارادوں تک پہنچ گئی تھی۔

جب وہ برائے نام رہ گیا تو اسے چٹکی سے چھوڑ دیا۔ فرش پر گر کر آخری حصہ تک جل گیا۔ جل کر راکھ ہو گیا۔ یہ رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ راکھ کے پیچھے چوری چھپ جاتی ہے، آدمی کی نیت نہیں چھپتی۔

میں نے کمرے میں آکر کوٹ اتار کر ایک طرف ڈال دیا پھر پلنگ پر ہاتھ پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا۔ عموماً خود کو آرام پہنچانے کے لئے اسی طرح پھیل کر لیٹا جاتا ہے لیکن میں نے اپنے اندر اسے پھیلتے دیکھا جسے کبھی نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ میرے تصور میں وہ منظر فلم کی طرح چلنے لگا جب شاہدہ بھینس کا دودھ دوہ رہی تھی۔ اس نے کھلے گریبان کا کرتا پہنا ہوا تھا۔ میں اس کے کہنے پر دودھ سے بھرا ڈول اٹھانے کے لئے جھکا تو جھکتے ہی کچھ نظر آیا۔ نظر آنا اور بات ہے، سمجھ میں آنا اور بات ہے۔ وہ مہینوں پہلے کی بات آج سمجھ میں

آ رہی تھی اور دل کو دیوانہ وار دھڑکا رہی تھی۔

میں چاچی کی آواز سن کر اٹھ بیٹھا۔ وہ کمرے میں آ کر پوچھ رہی تھیں "اپنے ابا کو جو خط لکھا تھا' وہ پوسٹ کر دیا؟"

میں نے چونک کر چاچی کو دیکھا پھر کہا "اوہ چاچی۔ بالکل بھول گیا۔"

"پتر! تو نے ہی کہا تھا کہ راستے میں پوسٹ آفس پڑتا ہے۔ لفافہ خرید کر اسے پوسٹ کر دے گا۔ مجھے دے دیتا تو صبح ہی لیٹر بکس میں ڈال آتی۔"

میں نے پھر چاروں شانے چت ہو کر کہا "کوئی بات نہیں۔ کل پوسٹ کردوں گا۔"

"کل بھی تو نے کل کہا تھا۔ لا خط مجھے دے۔ شاہدہ بازار جا رہی ہے۔ وہیں پوسٹ آفس سے لفافہ لے کر پتا لکھ کر روانہ کر دے گی" انہوں نے شاہدہ کو آواز دی "شادہ! کہاں ہے؟ ادھر آ۔"

دور سے اس کی آواز گنگناتی آئی "آ رہی ہوں"

مجھے ایسے لگا جیسے وہ میرے پاس آنے کے لئے "آ رہی ہوں" کہتی آ رہی ہے۔ میں نے کروٹ بدل کر دیوار کی طرف منہ کر لیا۔ فی الوقت یہ حالت تھی کہ نظر نہ آنے کے باوجود اپنی فلم دکھا رہی تھی۔ حواس پر چھاپا مار رہی تھی۔ پھر ایک نئی ڈگمگاتی ہوئی نیت سے دیکھنے پر کیا قیامت ڈھائے گی؟ اس لئے میں نے منہ پھیر لیا تھا۔

میرے کمرے کی طرف آتے وقت قدموں کی دھمک سنائی دی پھر اس کی آواز سنائی دی "جی امی!"

چاچی نے پوچھا "تو بازار جا رہی ہے؟"

"کیا آپ بازار جانے پر اعتراض کریں گی۔ یہ صاحب جو منہ پھیر کر لیٹے ہوئے ہیں انہوں نے اعتراض فرمایا ہوگا۔"

"اری یہ بات نہیں ہے۔ بازار جا رہی ہے تو اس کا خط لیتی جا۔ پوسٹ آفس سے لفافہ لے کر پتا لکھ کر پوسٹ کر دینا۔"

اس نے پوچھا "کہاں ہے خط؟"

چاچی نے مجھ سے پوچھا "بتا دو کہاں ہے؟"

"کوٹ کی جیب میں ہے۔"

میں ادھر نہیں دیکھ رہا تھا۔ ماں بیٹی کی آوازیں سن رہا تھا۔ چاچی یہ کہتی ہوئی وہاں سے جانے لگیں "جیب سے خط نکال لے اور یہاں کھڑی رہ کر بک بک نہ کرنا۔ یہ کالج سے تھکا ہوا آیا ہے اسے آرام کرنے دے۔"

ان کی آواز دور ہوتی گئی۔ وہ جا چکی تھیں۔ میں بستر پر اوندھا ہو گیا۔ دونوں بازوؤں میں منہ چھپا کر چوری سے اسے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ گردن سے نیچے دکھائی دے رہی تھی۔ اگر چہرہ دیکھنے کے لئے اپنا بازو اوپر اٹھاتا تو وہ مجھے دیکھتے ہوئے دیکھ لیتی۔ ہمارے

درمیان کبھی پردہ نہیں رہا۔ میں اب بھی آزادی سے دیکھ سکتا تھا لیکن میری نظروں کی معصومیت میں فرق آ گیا تھا۔ معصومیت مشکوک ہونے کے باوجود میرے دل میں کوئی بدمعاشی نہیں تھی۔ میری نظریں شکاری نہیں بھکاری تھیں۔ بھیک میں پوری روٹی نہیں ملتی۔ پوری دولت نہیں ملتی۔ میری نگاہوں کو اس کے بدن کی خیرات کہیں کہیں سے مل رہی تھی۔ کبھی ادھر سے نظر آ رہی تھی۔ اس نے کوٹ اٹھا کر ہینگر میں لگایا پھر الماری کے پاس جا کر اسے کھولا اور وہاں میرا کوٹ لٹکانے کے بعد الماری بند کر دی .... اس کے بعد کمرے سے جانے لگی۔ میں جس طرح بازوؤں میں منہ چھپائے ہوئے تھا اس زاویے سے اپنے کمرے کا دروازہ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ میری محدود نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ ظاہر ہے اسی رفتار سے چلتی ہوئی دروازے سے گزرتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی ہوگی۔ کمرہ اس سے خالی ہو گیا تھا۔ میں نے تھوڑی دیر انتظار کیا۔ اس کی آہٹ نہیں ملی تو سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ دروازے پر کھڑی دونوں ہاتھ کمر پر رکھے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ میں نے جلدی سے بازوؤں میں منہ چھپا لیا۔ اس کی ہنسی دور ہوتی جا رہی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ مجھ سے زیادہ سمجھ دار تھی۔ بڑی دیر سے میری چور نگاہی کو سمجھتی رہی تھی۔

میں چاروں شانے چت ہو گیا۔ اس کی وہ تمام شرارتیں جو کرتی رہی تھی' مجھے یاد آ رہی تھیں۔ میں اناڑی اسے محض چچا کی بیٹی سمجھتا رہا۔ آج اس راکھ ہونے والی تحریر نے سمجھا دیا تھا کہ وہ جوانی میں کزن ہوتی ہے۔ یہی بات شاہدہ کو کسی نے نہیں سمجھائی تھی۔ اس کے باوجود وہ اکثر مجھے کزن کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔

"کزن! ذرا وہ ڈول اٹھا کر دو۔"

"کزن! صبح نماز کے لئے اٹھو تو مجھے جگا دینا"

"کزن! بین الاقوامی میں کتنے الف ہوتے ہیں۔"

اور میں کہتا تھا "دس جماعتیں پاس کر چکی ہو اور تمہیں بین الاقوامی کے ہجے نہیں آتے۔ شرم کرو۔"

اب مجھے شرم آ رہی تھی۔ میں خواہ مخواہ کزن کے سہولت بھرے رشتے کو شیطان کی آنت کی طرح پیچیدہ سمجھ رہا تھا۔ میں نے کروٹ لے کر دروازے کو دیکھا جہاں سے وہ ہنستی ہوئی گئی تھی اور اپنی ہنسی میری اندر چھوڑ گئی تھی۔ وہ ابھی تک مجھے سنائی دے رہی تھی۔ مجھے یاد آیا وہ نہانے کے بعد کیسے پیارے انداز میں بدن کو خم دے کر گیلے بالوں کو جھٹکتی تھی۔ میں نیم کے سائے میں پڑھتا رہتا تھا۔ بھیگی زلفوں کے چھینٹے مجھ تک آتے تھے۔ یہ سب دور دور کی حکایتیں تھیں۔ میں نے کبھی اسے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ ایک بار اس کے دوپٹے کو پکڑا تھا۔ آج وہ میرے دونوں ہاتھوں میں پکڑی ہوئی سی لگ رہی تھی۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پتا نہیں میری کون سی رگ چھیڑ دی گئی تھی کہ نہ لیٹنے سے آرام

آ رہا تھا نہ بیٹھنے سے قرار مل رہا تھا۔ میں بستر سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ جب تک اپنے اندر کی خوشی کا اظہار کھل کر نہ کیا جائے' بے چینی نہیں جاتی۔ میں شاہدہ کو نہیں بتا سکتا تھا کہ میں کیوں خوش ہوں؟ ابھی مجھ میں جرات اظہار کی کمی تھی۔ میں کمرے سے باہر آ گیا۔ راہداری سے گزرتا ہوا چاچی کے کمرے میں آیا۔ وہ پلنگ کے سرے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ چاچا کرسی پر تھے۔ حقہ گرم کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر کہا "آؤ بیٹے تمہاری چاچی کہہ رہی تھیں تم سو رہے ہو۔"

میں پلنگ پر آ کر بیٹھ گیا۔ پھر لیٹتے ہوئے اپنا سر چاچی کے زانو پر رکھ دیا۔ میرا بچپن اسی گود میں گزرا تھا۔ میں انہی زانوؤں پر لوریاں سنتے سنتے سو جایا کرتا تھا۔ آج ایک مدت کے بعد پھر ان کے زانو پر سر رکھا تو وہ ممتا سے بھر گئیں۔ بڑے پیار سے میرے سر کو سہلاتے ہوئے بولیں' "کیا بات ہے' آج میرے بیٹے کو بڑا پیار آ رہا ہے۔"

"چاچی! میں بولوں گا تو آپ یقین نہیں کریں گی۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے آج ہی میں نے آپ کو دیکھا ہے۔ آج ہی پیار آ رہا ہے۔ آج سے پہلے آپ کہاں تھیں؟"

وہ دونوں ہنسنے لگے۔ پھر چاچا نے پوچھا "کچھ تو معلوم ہو کہ اپنی چاچی پر اتنا پیار کیوں آ رہا ہے؟"

میں نے کہا "پیار تو ہمیشہ اپنے رشتوں پر قائم رہتا ہے۔ ہم ہی مصروفیات کے باعث ادھر ادھر گم رہتے ہیں۔ ہمارے خون کا' ہمارے دودھ کا اور ہماری کسی نئی محبت کا رشتہ سامنے ہوتا ہے اور ہمیں اپنی الجھنوں میں اس کے وجود کا پتا نہیں چلتا۔ جب اچانک پتا چلتا ہے تو اس پر اتنا پیار آتا ہے' اتنا پیار آتا ہے کہ ...."

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ انہیں دونوں بازوؤں میں لے کر بولا۔ "آپ مجھے بچپن میں کیسے پیار کرتی تھیں؟"

میں نے پیار مانگنے کے لئے اپنا ایک گال ان کی طرف کیا۔ انہوں نے ہنستے ہوئے ایک بوسہ لیا۔ میں نے بھی پلٹ کر انہیں پیار کیا تو وہ ہنستے ہنستے بولیں "یہ لڑکا آج دیوانہ ہو گیا ہے۔"

میں اچھل کر پلنگ سے فرش پر آیا پھر بولا "آپ کو بیسن کے لڈو بہت پسند ہیں۔ میں ابھی موٹر سائیکل پر فراٹے بھرتے ہوئے جاؤں گا اور ابھی لے کر آ جاؤں گا۔ پھر اپنے ہاتھ سے آپ کو لڈو کھلاؤں گا۔"

میں سپاہی کی طرح اٹینشن ہو گیا۔ چاچی کو سیلوٹ کیا تو دونوں ہنسنے لگے۔ میں اباؤٹ ٹرن ہو کر لیفٹ رائٹ' لیفٹ رائٹ کہتا ہوا کمرے سے باہر آ گیا۔ وہ اتنے خوش تھے کہ باہر تک ان کی ہنسی سنائی دے رہی تھی۔ انہیں جیسے دو جہان کی خوشیاں مل رہی تھیں۔ یہی میں محسوس کر رہا تھا کہ محبت کا جو اظہار کرنا چاہئے تھا' وہ میں نے کھل کر کیا تھا۔ بڑی بے باکی سے کیا تھا۔ انہیں دو جہاں ملے تھے' مجھے پوری کائنات ملی تھی۔ میں نے آج مادر

کائنات کو چوم لیا تھا۔

میں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی پھر بازار کیطرف چل پڑا۔ میں جو بھی حرکتیں کر رہا تھا وہ غیر شعوری طور پر کر رہا تھا۔ خدا جانتا ہے کہ میں نے چاچی سے اتنا پیار کیوں کیا؟ یہ بعد میں علم نفسیات نے سمجھایا اور یہ بھی سمجھایا کہ بازار میں صرف بیسن کا لڈو نہیں ملے گا' شاہدہ بھی دیکھنے کو ملے گی۔ لیکن وہ نظر نہیں آئی۔ میں مٹھائی خریدنے کے بعد یونہی سڑکوں پر موٹر سائیکل دوڑاتا رہا۔ کئی بار پوسٹ آفس کے سامنے سے گزرا تو دل نے کہا۔ میری نگاہیں اسے ڈھونڈ رہی ہیں۔

جسے ڈھونڈ رہے تھے گلی گلی۔ وہ دلبر جانی گھر میں ملی۔ میں واپس آیا تو وہ کوٹھی کے احاطے میں داخل ہو رہی تھی۔ میں نے موٹر سائیکل اس کے قریب لا کر روک دی۔ اس نے مجھے دیکھا پھر دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولی "اچھا تو میرا پیچھا کیا جا رہا ہے۔"

میں نے موٹر سائیکل ایک طرف کی پھر کہا "مجھے کیا ضرورت ہے پیچھا کرنے کی؟ میں ایسی چیز خرید کر لایا ہوں جو تم ماں بیٹی کو بہت پسند ہے مگر تمہیں نہیں دوں گا۔"

وہ کوٹھی کے اندر گئی۔ میں اس کے پیچھے چلتا ہوا چاچا' چاچی کے کمرے میں آیا۔ چاچی نے کہا "میں سوچ ہی رہی تھی دونوں ساتھ واپس آئیں گے۔"

وہ بولی "آپ غلط سوچ رہی تھیں۔ مجھے تو موٹر سائیکل سے وحشت ہوتی ہے۔ ویسے میں نے خط پوسٹ کر دیا ہے اور یہ ہے آپ کے لئے بیسن کے لڈو۔"

وہ اپنے تھیلے سے مٹھائی کا ڈبا نکال رہی تھی۔ میں نے بھی شاپنگ بیگ سے مٹھائی کا ڈبا نکالتے ہوئے کہا "یہ تو میں لایا ہوں اپنی چاچی کے لئے۔"

چاچا نے کہا "تعجب ہے' تم دونوں الگ گئے تھے مگر ایک ہی چیز لائے ہو اور وہ بھی اپنی امی چاچی کے لئے۔ میں بے چارہ تو کسی کھاتے میں نہیں ہوں۔"

"چاچا! آپ کھاتے میں بھی ہیں اور پیتے میں بھی لیکن یہ کھاتی پیتی لڑکی بھینس کی طرح موٹی ہو رہی ہے۔ اسے دبلا کرنے کا ایک ہی راستہ ہے۔ وہاں امی اور ابا کے پاس بھیج دیں۔ کھیتوں میں ہل چلائے گی' فصل کاٹے گی تو ٹھیک ٹھاک رہے گی۔"

چاچا اور چاچی نے ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھا پھر چاچی بولیں "بیٹے! تم جب کہو گے یہ تمہاری امی کے پاس چلی جائے گی۔"

شاہدہ شرماتے ہوئے زیر لب مسکراتے ہوئے کمرے سے جانے لگی۔ تب مجھے عقل آئی کہ میں نے چھیڑنے کے لئے روانی میں کیا کہہ دیا ہے اور اس کا مطلب کیا نکل آیا ہے۔ حالانکہ جو مطلب نکلا وہ حسب حال تھا۔ مجھے تو یہ دیکھ کر حال آ گیا کہ وہ کس ادا سے مسکراتی گئی تھی۔

رات کا کھانا ہم ایک ساتھ بیٹھ کر کھایا کرتے تھے۔ اس رات کھانے کے بعد بارش ہونے لگی۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا۔

چاچی کی آواز آ رہی تھی- وہ بیٹی سے کہہ رہی تھیں .... "نی شاہدہ! صحن میں کپڑے پڑے ہیں- جلدی اٹھا لے- ڈربے پر ترپال ڈال دے' نہیں تو مرغیاں بھیگ جائیں گی-"

میں اس کھڑکی کے پاس آیا' جو صحن میں کھلتی تھی _ میں نے اسے کھول کر دیکھا- پورے صحن میں بلب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی- وہ تیزی سے آکر روشنی اور بارش میں نہانے لگی- بارش خاصی تیز تھی- وہ دیکھتے ہی دیکھتے تربتر ہو گئی تھی- الگنی سے کپڑے اتار کر دوڑتی ہوئی جاتی تھی پھر واپس آ کر الگنی سے دوسرے کپڑے سمیٹنے لگتی تھی- اتنی دیر میں اس کا لباس بھیگ بھیگ کر ٹرانسپیرنٹ بن گیا تھا- بدن سے ایسے چپک گیا تھا جیسے نظریں شیشے کے آر پار نظاروں سے چپک جاتی ہیں- میں تو پلکیں جھپکنا بھول گیا تھا-

اس نے ایک الگنی کا کپڑا سمیٹتے ہوئے مجھے گھور کر دیکھا- گویا وہ دیر سے سمجھ رہی تھی کہ بڑی دیر سے دیکھی جا رہی ہے- اس نے ایک ادائے ناز سے گردن گھمائی پھر منہ پھیر کر صحن سے کوٹھی کے اندر آنے کے لئے بڑھی- میری نظروں سے اوجھل ہو گئی- ابھی صحن میں بہت کام پڑا تھا- وہ پھر آنے والی تھی- میں وہیں کھڑا رہ گیا- اس نے مجھے تصویر حیرت بنا کر کھڑکی کے فریم سے چپکا کر رکھ دیا تھا-

وہ تھوڑی دیر بعد صحن میں آئی- اب وہ جلدی میں نہیں تھی لیکن چاچی کو جلدی تھی- وہ راہداری میں کھڑی پوچھ رہی تھیں "یہ تو بار بار بارش میں بھیگنے کیوں جا رہی ہے؟"

اس نے چور نظروں سے میری طرف دیکھا- پھر اونچی آواز میں کہا "مرغیوں کو بھیگنے سے بچا رہی ہوں- کسی کے لئے تو بھیگنا ہی پڑتا ہے-

وہ ڈربے کے پاس گئی- اندر مرغیاں شور مچا رہی تھیں- وہ ڈربے پر ترپال ڈالنے لگی- ایسے اطمینان سے دھیرے دھیرے کام کر رہی تھی جیسے کسی فلم کی ہیروئن سلوموشن میں بھیگتی ہوئی دیکھنے والوں کو جذبات میں بھگو رہی ہو- میں گہری گہری سانسیں لے رہا تھا جیسے تاب نظارہ نہ ہو- دیکھتے رہنے کے باوجود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' کیا کیا دیکھوں؟ کہاں کہاں دیکھوں؟ دیکھنے کے لئے دو آنکھیں کم پڑ گئی تھیں-

پھر وہ بھیگتی ہوئی میری کھڑکی کے سامنے آ گئی- گھور کر بولی "یہ اتنی دیر سے کیا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہو؟"

میں ذرا سٹپٹایا- ذرا ہچکچایا پھر بولا "وہ مم ...... میں' بات یہ ہے کہ یہاں سے ٹھنڈی ہوائیں آ رہی ہیں-"

وہ دونوں ہاتھ اپنی کمر پر رکھتی ہوئی بولی "میں خوب سمجھتی ہوں' تمہیں کیسی ہوا لگ رہی ہے- امی سے جا کر بولوں؟"

میں ایک دم سے گھبرا گیا- دونوں ہاتھ انکار کے انداز میں ہلاتے ہوئے بولا "نن .... نہیں' پلیز- میں اب کبھی نہیں دیکھوں گا-"

یہ کہتے ہی میں نے کھڑکی کے دونوں پٹ بند کر دیئے- جلدی سے آ کر اپنی میز کے پاس بیٹھ گیا- میں نے دروازہ بند رکھا تھا' اس لئے یہ نہ دیکھ سکا کہ وہ صحن سے آ کر اپنے کمرے میں گئی ہے یا ماں سے میری شکایت کرنے؟

میں رات کو دیر تک پڑھتا رہتا تھا- اس رات ایک لفظ بھی نہ پڑھا گیا- یہی فکر ستاتی رہی کہ میں چاچی اور چاچا کی نظروں سے گر جاؤں گا- ہو سکتا ہے وہ مجھے دھکے دے کر گھر سے نکال دیں یا میرے والدین کو یہاں بلا کر مجھے ذلیل کریں- اگرچہ بڑی حد تک امید تھی کہ وہ مجھے داماد بنانا چاہتے ہیں لیکن شریف گھرانوں میں شادی سے پہلے داماد کو کھلی چھٹی نہیں دی جاتی- یہ پورا یقین نہیں تھا کہ بات بن سکتی ہے- بات بگڑ بھی سکتی تھی-

میں نے خود کو لعن طعن کیا- میں ایسا تو نہیں تھا- میں نظریں جھکا کر رہتا تھا- پھر میں نظریں گاڑ کر اسے کیوں دیکھتا رہا-

اگلی صبح میں نے نماز پڑھ کر دعا مانگی' "یا اللہ! میری عزت رکھ لے- اگر شاہدہ نے ماں باپ سے شکایت نہیں کی ہوگی اور میری پہلی غلطی معاف کی ہوگی تو یہی آخری غلطی ہوگی- آج کے بعد میں اسے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھوں گا-"

میں نے نماز کے بعد معمول کے مطابق کلام پاک کی تلاوت کی- مجھے بڑا سکون مل رہا تھا- یقین سا پیدا ہو رہا تھا کہ کچھ نہیں ہوگا- آخر وہ بھی شرم والی ہے- ماں باپ سے ایسی بات بتاتے ہوئے اسے شرم آئے گی- اس بار میری شرافت اور معصومیت کا بھرم رہ جائے تو پھر میں شاہدہ کے خیال سے ہی کان پکڑ لوں گا-

ناشتے کی میز پر سب ہی کا موڈ اچھا تھا- ایک میں ہی گھبرایا ہوا تھا- میں نے چور نظروں سے شاہدہ کو دیکھا تو وہ شرارت سے مسکرا رہی تھی- اس نے میری چور نظروں کو تاڑ کر اپنی آنکھوں کے اشارے سے دھمکی دی- دھمکی کے انداز میں آنکھوں نے پوچھا- "

"کیا بزرگوں سے وہی بات کہہ دوں-"

میں گھبرا کر ناشتے پر سے اٹھ گیا- چاچا نے پوچھا "یہ کیا؟ تم نے ناشتہ کیوں چھوڑ دیا؟"

"جی- وہ بات یہ ہے کہ کچھ کھانے کو جی نہیں کر رہا ہے-"

چاچی نے پوچھا "جی کیوں نہیں کر رہا- کیا کالج سے واپس آنے تک بھوکے رہو گے- بیٹے! بیٹھ جاؤ' جی نہ کرے تب بھی زبردستی کھاؤ-"

"چاچی! مجھ سے جبراً" کھایا نہیں جائے گا- پلیز آپ فکر نہ کریں' میں بھوکا نہیں رہوں گا-"

میں فوراً" وہاں سے جانا چاہتا تھا تاکہ شاہدہ سے سامنا نہ رہے- میں اس کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن یہ بے اختیاری سمجھ میں نہیں آتی' میں نے پتا نہیں کیسے بے اختیار ہو کر اسے دیکھا- اس نے آنکھوں کے اشاروں سے بیٹھنے اور کھانے کو کہا- میں

ایک دم سے بیٹھ گیا۔ اس کے اشاروں پر عمل نہ کرتا تو منہ چھپا کر گھر سے بھاگنا پڑتا۔ مجھے دوبارہ ناشتہ کرتے دیکھ کر چاچی اور چاچا حیران ہوئے۔ شاید ان کے تجربات میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ لڑکی کے ہاتھ میں کوئی کمزوری آ جائے تو لڑکا کٹھ پتلی بن جاتا ہے۔

ناشتے کا مرحلہ خیریت سے گزر گیا۔ جب موٹر سائیکل پر کالج کے لئے روانہ ہوا تو یقین ہو گیا کہ پچھلی رات والی بات بزرگوں تک نہیں پہنچی۔ یہ لڑکیاں بڑی "وہ" ہوتی ہیں۔ اس نے رات کا بھیگا بھیگا منظر بھی دکھایا اور آنکھیں بھی دکھائیں' مہربان بھی ہوئی اور سزا کے خوف میں بھی مبتلا رکھا۔ ساری رات ستایا جلایا تھا' صبح میرا پردہ رکھ لیا تھا۔ آنکھوں سے دھمکی دی تھی اور لبوں پر ہلکا سا تبسم بھی رہا تھا۔ یہی ادائیں اگلی چھیڑ خانی کا حوصلہ دیتی ہیں لیکن میں نے فجر کی نماز میں دعا مانگ کر اس کے خیال سے بھی توبہ کر لی تھی۔ کالج کے برآمدے میں اسلم سے ملاقات ہوئی۔ وہ اپنے تین ساتھیوں کے مقابلے میں بہت ہی دبلا سا لڑکا تھا۔ قد بھی چھوٹا سا تھا۔ سر کے بال گردن تک بڑھے ہوئے تھے۔ کبھی وہ ریشمی قمیض اور شلوار پہن کر آتا تو پیچھے سے بالکل لڑکی جیسا لگتا تھا۔ اس نے اپنے نازک ہاتھوں سے میرا ہاتھ تھام کر کہا "ہم چاروں تم سے بہت شرمندہ ہیں۔ ہم نے تمہارا مذاق اڑایا۔ اس کی ہمیں سزا مل رہی ہے۔"

میں نے حیرانی سے پوچھا "کیسی سزا؟ کون سزا دے رہا ہے؟"

وہ ہائے کے انداز میں سانس چھوڑتے ہوئے بولا "ہاں۔ قدرت کسی کو معاف نہیں کرتی۔ قاسم کل رات سے قے کر رہا ہے۔ کل تمام رات اسے ایک سو پانچ ڈگری بخار رہا۔"

میں نے بے یقینی اور حیرانی سے کہا "ایک سو پانچ ڈگری؟ میں نے تو سنا ہے' آدمی ایک سو پانچ میں مرجاتا ہے۔"

"وہ تم سے معافی مانگنے کے لئے زندہ ہے۔"

"کیسی بات کرتے ہو۔ تم لوگوں سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ میں کسی سے ناراض نہیں ہوں تو معافی کس بات کی؟"

"یہ تمہارا بڑا پن ہے کہ تم ہم سے ناراض نہیں ہو لیکن قاسم کے دل پر بوجھ ہے۔ اگر تم اس کے پاس جا کر اسے معاف نہیں کرو گے تو اس کا ضمیر پھر اسے بیمار ڈال دے گا۔"

"وہ کہاں ہے؟"

"اپنی کوٹھی میں ہے۔ ریاض اور محمود بھی وہیں ہیں۔ یار! بیمار کی عیادت کرو تو اس کی آدھی بیماری ختم ہو جاتی ہے۔"

اس سے گفتگو کے دوران یہ بات میرے دماغ میں گھوم رہی تھی کہ ان چاروں کی شرارت یا مہربانی سے ہی شاہدہ میری زندگی میں بہار بن کر آئی ہے۔ تب یہ خیال آیا کہ

میں شاہدہ کے حوالے سے قاسم کی عیادت کے لئے جا رہا ہوں۔ جب کہ میں اس سے توبہ کر چکا ہوں۔ اللہ میاں سے وعدہ کر چکا ہوں کہ پہلی غلطی معاف ہو جائے تو پھر کبھی آنکھ اٹھا کر اسے نہیں دیکھوں گا۔

انسان اکثر نادانی میں بچگانہ دعائیں مانگتا ہے' بھلا آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنے کی دعا کیسے قبول ہو سکتی ہے جبکہ خدا نے آنکھیں دیکھنے کے لئے دی ہیں۔ دشمن کو نہ دیکھنا چاہو تو حالات اسے بھی دیکھنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ میں شاہدہ کو کسی ارادے سے نہ دیکھتا' کزن کے رشتے سے دیکھتا تب بھی اس کا بدن ہی نظر آتا تھا۔ اس کی دل نشین صورت' اس کی دل دھڑکانے والی مسکراہٹ اور اس کی خاموشی سے چھیڑنے والی ادائیں ایسی تھیں جن پر آنکھ اٹھتی ہی رہتی۔ اندھا ہونے کے بعد ہی آنکھ نہ اٹھنے کی دعا قبول ہو سکتی تھی۔

قاسم کی کوٹھی بہت بڑی بہت شاندار تھی۔ اس کا باپ کروڑ پتی سیاست دان تھا۔ اس نے وہ کوٹھی اپنے بیٹے قاسم کے لئے بنوائی تھی تاکہ وہ شہر میں رہ کر تعلیم حاصل کرے۔ اس کے والدین اپنی جاگیر میں رہا کرتے تھے اور اپنی رعایا کے ہزاروں ووٹوں سے اسمبلی میں پہنچا کرتے تھے۔ اسلم مجھے کوٹھی کے اندر لایا۔ قاسم ایک بیڈ روم میں بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔ محمود اور ریاض نے گرم جوشی سے میرا استقبال کیا۔ قاسم نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "دوست! آج تم نے یہاں آ کر میری کوٹھی کی شان اور میری عزت بڑھا دی ہے۔"

میں نے کہا "شرمندہ نہ کرو۔ میں تو تمہاری بیماری کا حال سن کر آیا ہوں۔"

"کیسی بیماری؟ میں تو تمہیں دیکھتے ہی اچھا ہو گیا ہوں۔ وہ کیا بھلا سا شعر ہی کہ آپ کو دیکھنے سے بیمار کے چہرے پر رونق شونق آ جاتی ہے۔ بس ایسے ہی میں تندرست ہو گیا ہوں۔"

میں اس کی باتوں کے دوران اس کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ بستر پر تاش کے پتے بکھرے ہوئے تھے۔ سرہانے کی میز پر کچھ پھل اور کچھ خشک میوے چاندی کی تھال میں رکھے ہوئے تھے۔ میز کے نچلے خانے میں بیئر کی بوتلیں تھیں۔ دیوار پر ایک بڑے سے فریم میں ایک نیم عریاں حسینہ انگڑائی کے لئے ہاتھ اٹھا کر جذبات کے آسمان کو چھو رہی تھی۔

ریاض نے کہا "تمہیں لڑکیوں سے دلچسپی نہیں ہے۔ کہو تو اس تصویر کو یہاں سے ہٹا دیا جائے۔"

میں چاہتا تھا وہ ہٹ جائے لیکن رسماً کہا "میرے لئے زحمت نہ کرو۔ میں ابھی چلا جاؤں گا۔"

"یار! کیسے جاؤ گے۔ کھڑکی کے باہر دیکھو بارش ہو رہی ہے۔"

محمود پلنگ پر چڑھ کر تصویر کے پاس گیا پھر اسے دیوار سے اتارتے ہوئے بولا "جب قاسم کے ابا یہاں آتے ہیں تو تصویر یوں بدل جاتی ہے۔"

اس نے انگڑائی لینے والی حسینہ کی بڑی سی تصویر کو پلٹ کر پھر دیوار سے لگا دیا۔ حسینہ دیوار میں چھپ گئی۔ تصویر کے دوسری رخ پر ایک مقدس مقام کی ایمان افروز تصویر تھی۔ میں دم بخود رہ گیا۔ اتنا بڑا فریب؟ ایمان اور تقدس کا مذاق اڑانے والی بات تھی' میں نے بھڑک کر کہا "یہ .... یہ بڑے شرم کی بات ہے۔ تم لوگوں کو خدا کا ذرا خوف نہیں ہے؟"

قاسم نے کہا "اس میں شرم یا خوف کی کیا بات ہے؟ جس طرح وہ حسینہ پیچھے چھپ گئی ہے کیا اسی طرح عبادت اور دعاؤں کے دوران کوئی عورت ہمارے اندر چھپی نہیں رہتی ہے۔"

یہ بات مجھے پتھر کی طرح لگی۔ کل سے میری یہی حالت تھی۔ میں نے مغرب اور عشاء کی نمازیں پڑھیں تو کئی بار شاہدہ کا خیال آیا اور میں نے اسے اپنی اندر چھپا لیا۔ صبح کی نماز میں خوفزدہ ہو کر اسے اندر سے نکالنے میں مصروف رہا۔ یہ پتا نہیں چلا کہ میں نے کس طرح نماز ادا کی تھی۔

محمود نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا "تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں۔ جو رخ بد نما ہوتا ہے اسے ہم چھپا سکتے ہیں لیکن اسے مٹا نہیں سکتے۔ فنا نہیں کر سکتے۔ برائی اس لئے فنا نہیں ہوتی کہ قدرت آدمی کو اس سے لڑنا اور اس پر غالب آنا سکھاتی ہے۔"

ریاض نے کہا "صرف اس تصویر کو نہ دیکھو کہ اس کے ایک طرف ایمان اور دوسری طرف بے ایمانی ہے۔ یہ دوغلا پن ہمیں اپنے ملکی قوانین اور مفاد پرست سنسر بورڈ سے ملتا ہے۔ جس سینما کے اسکرین پر روح پرور مناظر پیش کئے جاتے ہیں اسی اسکرین پر نیم عریاں حسینہ کا رقص دکھایا جاتا ہے۔"

اسلم نے کہا "ہمارے ملک کے ٹی وی اسکرین پر وزارت تجارت سگریٹ پینے کا ترغیبی اشتہار پیش کرتی اور ان ہی لمحات میں وزارت صحت سگریٹ کو مضر صحت کہتی ہے۔ ایک ہی اسکرین پر دو رخی باتیں اسی لئے ہوتی ہیں کہ تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں۔ انسان اپنی فطرت سے مجبور ہے۔ کاروبار میں حرام منافع سے اور جذبات میں گناہ کی لذت سے باز نہیں آتا۔"

اس بات پر سب قہقہے لگانے لگے۔ قاسم "یار! ہم لوگ تو من موجی ہیں۔ اپنی کھال میں مست رہتے ہیں۔ کوشش کرتے ہیں کہ ہم سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ اگر ہم سے تمہیں کوئی تکلیف پہنچی ہے تو ہمیں ...."

محمود نے کہا "سننے والوں کے لئے قصہ ہو سکتا ہے مگر ہے حقیقت۔ میرے محلے میں ایک نوجوان شاہنواز رہتا تھا۔ برا نہ ماننا' تمہاری طرح آدم بیزار تھا۔ کسی سے دوستی نہیں کرتا تھا۔ محلے میں بھی شاید ہی کسی سے بات کرتا ہو۔ میں نے اس سے دوستی کی کوشش کی۔ اس نے نظر انداز کر دیا۔ بس یہی انسلٹ برداشت نہیں ہوئی۔ میں کوئی گرا پڑا بندہ

ہوں کہ وہ مجھے دوستی کے قابل نہیں سمجھتا تھا۔"

قاسم نے ہاتھ اٹھا کر کہا "او یار! سیدھی سی بات ہے۔ جو محمود نے بتایا کہ وہ بندہ شاہنواز بڑا اوکھا ہے۔ کسی کے آگے گھاس نہیں ڈالتا ہے تو میں نے کہا ہم اس گدھے کے آگے گھاس ڈالیں گے۔ پھر جانتے ہو' میں نے کیا کیا؟"

میں نے تجسس سے پوچھا "کیا کیا؟"

اس نے کہا "بھئی محمود' تم ہی بتاؤ۔ میں کیا اپنے منہ سے بولوں؟"

محمود نے کہا "ہمیں پتا چلا کہ شاہنواز سانپوں سے بہت ڈرتا ہے۔ یہ معلوم ہوتے ہی قاسم نے ایک سپیرے کو پکڑا۔ وہ نشے کا عادی تھا۔ پانچ سو روپے کی عوض ایک سانپ لے آیا۔ ہماری ہدایت کے مطابق اسے ایک مٹھائی کے ڈبے میں رکھ کر اوپر سے رنگین کاغذ اور ربن کے ساتھ پیک کر دیا۔ ہم نے ایک تھیلے میں ایسے ہی چار مٹھائی کے ڈبے رکھے پھر شاہنواز کے دروازے پر آ کر دستک دی۔"

اس نے چاندی کی تھال سے کچھ بادام اٹھا کر منہ میں رکھے پھر انہیں چباتے ہوئے کہا "شاہنواز اکیلا تھا۔ ہم نے پہلے ہی معلوم کر لیا تھا کہ باقی گھر والے شیخوپورہ گئے ہیں۔ اس نے دستک سن کر دروازہ کھولا۔ میں نے کہا ہمارے دوست اسلم کی بہن کی بات پکی ہوئی ہے۔ اس خوشی میں یہ مٹھائی ہے۔ اس نے وہ ڈبا لے کر شکریہ ادا کیا۔ ہم دوسرے گھروں میں مٹھائی بانٹنے کے بہانے جلدی کھسک گئے۔ وہاں سے ذرا اور جا کر رک گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی شاہنواز کی چیخیں سنائی دیں۔ بچاؤ بچاؤ .... سانپ .... سانپ۔"

میں نے جلدی سے پوچھا "کیا سانپ نے اسے ڈس لیا؟"

قاسم نے میری پیٹھ پر ایک ہاتھ مارتے ہوئے کہا "یار بھولے بادشاہ! کیا جان بوجھ کر ہم نے زہریلا سانپ اسے دیا تھا؟ دراصل وہ سپیرا چرسی تھا۔ نشے کی طلب مار رہی تھی۔ وہ پانچ سو روپے کے لالچ میں اپنے جوگی مہاراج کا ایک پٹارا چرا لایا تھا۔ اس پٹارے میں زہریلا سانپ تھا۔"

محمود نے کہا "پڑوسیوں نے اسے اسپتال پہنچایا۔ وہ بچ گیا۔ ہم تو کئی ماہ تک اس کے سامنے نہیں گئے۔ ایک دن اسی نے میرا راستہ روک کر کہا۔ محمود بھائی' میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ آپ نہیں جانتے میں کینسر کا مریض تھا۔ خدا آپ کو اور نیکی دے' اس سانپ کے زہر سے کینسر کا مرض ختم ہو گیا ہے۔ آپ کبھی گھر آئیں میں میڈیکل رپورٹ دکھاؤں گا۔"

میں نے ہاں ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ واقعی میں نے ایک اخبار میں پڑھا تھا لیکن یقین نہیں آتا تھا۔ محمود اور قاسم وغیرہ چشم دید گواہ تھے۔ ایسا ہو چکا تھا۔ جوگی بابا نے اگلے روز ایک مریض کا علاج کرنے کے لئے کچھ پڑھ کر اس سانپ پر دم کیا تھا۔ چرسی سپیرا وہی سانپ چرا کر لے آیا تھا۔ یوں شاہنواز کو کینسر کے مرض سے نجات مل گئی تھی۔

میں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ انہوں نے شاہنواز کے قتل کے ارادے سے ایسا کیا تھا۔ وہ تو سانپ کو بے ضرر سمجھ کر اس کو ڈرانا چاہتے تھے۔ قاسم نے اپنی بات دہراتے ہوئے کہا "ہماری حرکتوں سے دوسروں کو یوں لگتا ہے جیسے ہم برا کر رہے ہیں جبکہ ہم ان کے حق میں بھلا کرتے ہیں۔ تم اپنی ہی بات لے لو۔ ہم شاہدہ کا نام لے کر تمہیں چھیڑ رہے تھے۔ جبکہ کالج میں شاہدہ نام کی کوئی طالبہ نہیں ہے۔"

اسلم نے ہنستے ہوئے کہا "اور ہمیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ تمہاری کزن کا نام شاہدہ ہے۔"

میں حیرانی سے سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ واقعی دیکھا جائے تو انہوں نے شاہنواز کے ساتھ برا کیا مگر اسے نئی زندگی دی تھی۔ کسی شاہدہ کا نام لے کر کالج میں میرا مذاق اڑایا تھا لیکن ان کا یہ برا عمل میرے اور شاہدہ کے لئے بھلا ہو رہا تھا۔ قاسم نے کہا "مرد جب مرد بن کر پیدا ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ایک عورت ہونا چاہئے۔ دن کی اہمیت اس وقت تک اجاگر نہیں ہو سکتی جب تک اس کے ساتھ رات نہ ہو۔ اسی طرح مرد کسی عورت کے وجود کے بغیر مرد نہیں کہلاتا۔ ہم نے سوچا تھا کہ کسی فرضی شاہدہ کے پیار کی آگ تمہارے دل میں بھڑکائیں گے۔ تمہیں زندگی کے ایک نئے خوب صورت پہلو سے روشناس کرائیں گے لیکن تم ہمیں عاشق مزاج اور آوارہ اسٹوڈنٹس سمجھتے ہو۔"

میں کشمکش میں تھا کہ انہیں کیا سمجھوں؟ فرشتے نہیں مان سکتا تھا اور آوارہ بدمعاش بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ معجزاتی طور پر کینسر کی علامتیں ختم ہو گئی تھیں۔ ایسا نہ ہوتا تو شاہنواز سانپ کی صرف دہشت سے مر سکتا تھا۔

میرے معاملے میں بھی انہوں نے جان بوجھ کر مجھے ایک محبت بھری زندگی دینے کے لئے میری کزن کا نام استعمال نہیں کیا تھا۔ اتفاقاً ایسا ہوا تھا کہ ایک فرضی شاہدہ کے حوالے سے میری کزن میری محبت کا مرکز بن گئی تھی۔ قاسم نے کہا "بھئی ہم اپنے مہمان دوست کو بور کر رہے ہیں۔ اسلم! باہر زبردست بارش ہو رہی ہے۔ موسم کی مناسبت سے گیت مالا دکھاؤ۔ مزہ آئے گا۔"

اسلم ٹی وی سی آر کے پاس چلا گیا۔ محمود بیئر کی بوتل کھولتے ہوئے مجھ سے بولا "بڑی ظالم شے ہے۔ ایک گلاس پی کر دیکھو۔ موسم رنگین ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "مجھے تو معاف کرو۔ اسے منہ لگانا تو کیا ہاتھ لگانا بھی پسند نہیں کرتا۔"

"کوئی بات نہیں۔ میوے اور پھل تو کھاؤ۔ کب سے تمہارے سامنے پڑے ہیں۔"

میں ان کی بات رکھنے کے لئے تھوڑا تھوڑا کھانے لگا۔ وہ چاروں اپنے اپنے لئے گلاس بھر رہے تھے۔ ٹی وی اسکرین روشن ہو چکا تھا۔ انڈین فلموں کے وہ گانے جو بارش میں فلمائے گئے تھے' انہیں ساون کے گیت کے عنوان سے پیش کیا جا رہا تھا۔ پہلا گیت شروع ہوا تو ایک حسینہ بھری برسات میں رقص کرتی ہوئی دکھائی دی۔ مجھے فلموں سے

دلچسپی نہیں تھی مگر اچانک ہی دل لگ گیا۔ اسکرین پر شاہدہ بھیگتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

میں پچھلی رات کی طرف مڑ گیا تھا۔ وہی بارش تھی وہی بدن تھا اور وہی بھیگا لباس تھا جو اس کا انگ انگ تراش رہا تھا۔ مجھے کوئی فلمی ہیروئن اچھی نہیں لگتی تھی۔ اگر وہاں شاہدہ نہ دکھائی دیتی تو میں کبھی نہ دیکھتا اور اس لئے بھی کھل کر دیکھ رہا تھا کہ وہ آنکھیں نہیں دکھا رہی تھی۔ اپنی امی سے شکایت کرنے کی دھمکی نہیں دے چکی تھی۔

بارش تھم گئی تھی' پھر بھی میں بیٹھا رہا۔ ایک کے بعد دوسرا گیت اچھا لگا۔ دوسرے کے بعد تیسرے نے اور جذبہ شوق کو بڑھایا۔ اسے میری دیوانگی کہہ سکتے ہیں کہ اسکرین مجھے بدلتی ہوئی ہیروئنوں کے چہرے نہیں دکھائی دے رہے تھے۔ دکھائی تو وہ دے رہی تھی جسے میرا دل چاہتا تھا۔ جہاں تک چاہنے کا تعلق ہے ہم کسی بھی حسینہ کی چاہت کر سکتے ہیں مگر میرا دل صرف اسے مانگ رہا تھا۔ قاسم نے میرا بازو پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا "کہاں کھو گئے؟ کیسے رہے ساون کے گیت؟"

میں نے قاسم کو دیکھا تو دھندلا سا نظر آیا۔ یوں کہنا چاہئے کہ وہ پوری طرح نظر نہیں آیا کیونکہ میری آنکھوں میں بارش کے کتنے ہی مناظر گھوم رہے تھے۔ وہ ایسی شعلہ بدن تھی کہ نہ بارش میں بجھ رہی تھی' نہ نگاہوں سے مٹ رہی تھی۔ میں نے خوابیدہ لہجے میں پوچھا "کیا اسے پھر دکھاؤ گے؟"

"او میرے یار! ایک نہیں ہزار بار دیکھو اور یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اس سے بھی زبردست آئیٹم ہے۔ اسلم! وہ گیت مالا دکھاؤ' جس میں سری دیوی' راجیش کھنہ کی تپسیا بھنگ کر دیتی ہے۔"

میں نے پوچھا "تپسیا بھنگ کرنا کیا ہوا تھا؟"

"اس کا مطلب ہے عبادت کی لگن اور توجہ کو ختم کر دینا اس گیت میں دکھایا گیا ہے کہ ایک بہت ہی عبادت گزار بندہ ہوتا ہے۔ اسے ایک حسینہ اپنے حسن و شباب کے جلوے اور ادائیں دکھا دکھا کر دیوانہ کر دیتی ہے۔"

میں نے وہ گیت مالا بھی دیکھا۔ کیا بتاؤں کہ ان گیتوں اور مناظر میں کیسے طوفانی جذبے دکھائے گئے تھے۔ میں تو جوان تھا اگر کوئی بچہ ہوتا تو بیٹھے بیٹھے بالغ ہو جاتا۔ ہمارے ملک کی آبادی اس لئے بھی بڑھ رہی ہے کہ موجودہ نسل کے جوان کم سنی میں ایسے مناظر دیکھ کر بچوں کے باپ بن رہے ہیں۔

میں صبح گھر سے نکلا تھا۔ اس روز اتنی فلمیں دیکھیں کہ واپسی میں شام ہو گئی۔ وہ موٹر سائیکل کی آواز سن کر چھت پر آئی پھر مجھے دیکھتی ہی پلٹ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ بھاگ کر چھت پر آنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ ہر موٹر سائیکل کی آواز پر اسی طرح دیوانہ وار آتی رہی ہے اور مایوس ہو کر جاتی رہی ہے۔ مجھے دیکھ کر اس نے "اونہہ" کے انداز میں منہ پھیر لیا تھا اور چلی گئی تھی۔

بے قراری بھی تھی۔ ناراضگی بھی تھی۔ نہ آؤ تو انتظار تھا۔ آؤ تو انکار تھا۔ اس کی ہاں میں نہ تھی اور نہ میں ہاں تھی۔ یوں کہنا چاہئے کہ اس نے پیار کو پہیلی بنا دیا تھا۔ جہاں تک اسے بوجھو' وہاں سے پھر ایک نئی پہیلی بنتی جاتی تھی۔ عورت کو سمجھنا چاہو تو یہ اپنی ذات میں یونیورسٹی بن جاتی ہے اور نت نئے معنی اور مفہوم پیدا کرتی چلی جاتی ہے۔

چاچی اور چاچا نے پریشان ہو کر پوچھا "کہاں رہ گئے تھے؟ صبح ٹھیک سے ناشتا بھی نہیں کیا اور اب اندھیرا ہونے کو ہے"

"اوہ چاچی! بادل چھائے ہوئے ہیں۔ اس لئے اندھیرا لگ رہا ہے۔ میں لائبریری میں بیٹھ کر پڑھ رہا تھا اس لئے دیر ہو گئی۔"

میں چاچا کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ شاہدہ کسی نہ کسی کام سے آ رہی تھی' جا رہی تھی یا پھر آتے جاتے رہنے کے لئے گھر کا کام بڑھا رہی تھی۔ مجھ سے ایسی بے نیاز تھی کہ ایک بار بھی چور نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ چاچی نے کہا بھی کہ چادر باہر لے جا کر کیوں جھاڑ رہی ہے۔ اس موسم میں گرد نہیں اڑتی مگر وہ خواہ مخواہ گرد جھاڑ رہی ہے۔ اس موسم میں گرد نہیں اڑتی مگر وہ خواہ مخواہ گرد جھاڑنے کے بعد چادر دوبارہ لا کر بستر پر بچھا رہی تھی۔ یہ بھی ایک انداز تھا کہ مجھے نہیں دیکھ رہی تھی مگر اپنے وجود کی رونق دکھاتی جا رہی تھی۔

رات کے کھانے کے بعد میں ذرا ٹہلنے کے لئے جاتا تھا لیکن بارش ہونے لگی تھی۔ اس لئے معمول کے مطابق کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ کر میز کے پاس پڑھنے بیٹھ گیا۔ اس کا دروازہ بھی کھلا رہتا تھا۔ میں نے نظریں کھلی ہوئی کتاب پر رکھیں مگر دھیان اس کے کمرے کی طرف تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے آواز سنی۔ سر گھما کر دیکھا تو اس نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس نے مجھے اپنے کمرے سے باہر پھینک دیا ہے۔ مجھے بہت برا لگا مگر یہ بھی فکر ہوئی کہ صبح سے پہلے نظر نہیں آئے گی۔

یہ سراسر بدمعاشی تھی۔ ہر رات کم از کم گیارہ بجے تک دروازہ کھلا رکھتی تھی۔ مجھے اپنے کمرے سے نظر آتی رہتی تھی۔ آج شام کو بھی خوب نظر آئی لیکن رات کی تنہائی اور ویرانی میں دیکھنے کا موقع آیا تو اس نے دروازے کو بند کر لیا۔ یہ تو واضح طور پر ترسانے اور تڑپانے والی شرارت تھی۔ میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ میرے اندر ساون کے گیت بھرے ہوئے تھے۔ برسات میں تو جلتے ہوئے گھر بجھ جاتے ہیں لیکن یہ برسات میرے اندر شعلے بھڑکا رہی تھی اور وہ بند دروازہ جلتی پر تیل چھڑک رہا تھا۔

میں نے گیارہ بجے تک بے چینی سے انتظار کیا۔ لیکن وہ مقدر کا دروازہ بند رہا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ میرے اندر کیسا اشتعال پیدا ہو رہا تھا۔ دماغ میں دھواں سا بھر رہا تھا۔ کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو گئی تھی۔ اگر وہ دروازہ نہ کھلتا تو میرا دماغ پھٹ جاتا۔ شکر ہے کہ وہ کھل گیا۔

دروازہ کھلتے ہی میں نے اسے اس نے مجھے دیکھا۔ نظریں چرا کر راہداری میں آئی۔ وہاں سے گھوم کر اپنی ماں کے کمرے کی طرف جانے لگی۔ میں نے اپنے کمرے سے نکل کر دیکھا۔ وہ ماں کے کمرے کی طرف نہیں گئی تھی۔ کچن کے سامنے رک کر مجھے دیکھ رہی تھی۔ پھر نظریں ملتے ہی وہ کچن میں چلی گئی۔ میری نظروں سے گم ہو گئی۔ کمبخت آنکھ مچولی کھیل کر میرا ستیاناس کر رہی تھی۔ دیکھا جائے تو اس کا یہ رومانی انداز صحت مندانہ تھا۔ محبوب کی ایسی اداؤں سے چاہت اور تڑپ بڑھتی ہے' صبر کی عادت پڑتی ہے اور ایک دوسرے کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے لیکن میں نے قاسم کی کوٹھی میں نو گھنٹے

تک ٹی وی اور وی سی آر کے سامنے رومانس کی شاعرانہ لطافت نہیں دیکھی تھی بلکہ خباثت دیکھی تھی۔ میرے اندر ایسے مناظر بھرے ہوئے تھے جن میں عورت کے حسن اور شرافت کی بوٹی بوٹی کی گئی تھی۔

ان لمحات میں میرے اندر شاعرانہ لطافت اور رومانس کی چاشنی نہیں تھی۔ صرف اور صرف برسات میں سلگتا ہوا بدن تھا۔ میں نے راہداری میں کھڑے ہو کر سوچا کیا کروں؟ کیا اس کے پیچھے کچن میں جاؤں؟

وہاں جانا مناسب نہیں تھا۔ چاچی کا کمرا کچن کے قریب تھا۔ ہمارے کچھ کہنے سننے کی آواز بزرگوں تک پہنچ سکتی تھی۔ اسی وقت برتن ٹکرانے کی آواز سنائی دی۔ کمرے سے چاچی نے پوچھا "نی شادہ! تو ہے؟"

"جی۔ میں ہوں' کچن کا دروازہ بند کر کے جا رہی ہوں۔"

میں نے سنا کہ وہ کچن سے نکلنے والی ہے تو میں لپک کر اس کے کمرے میں چلا آیا۔ دروازے کے پردے کے پیچھے چھپ گیا۔ چونکہ دروازہ کھلا ہوا تھا اس لئے میں راہداری کو اور اپنے کمرے کے کچھ حصے کو پردے کے پیچھے سے دیکھ سکتا تھا۔ شاہدہ کچن سے نکل کر راہداری میں چلتی ہوئی میرے دروازے کے سامنے رک گئی تھی۔ وہ دروازہ اس کی توقع کے خلاف بند تھا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ میں اسے دیکھنے کے لئے وہاں کھڑا رہوں گا لیکن اس کی خوش فہمی ختم ہو گئی تھی۔

اس نے صحن کی طرف دیکھا۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ یہ سوچ نہیں سکتی تھی کہ میں صحن میں بھیگنے جاؤں گا اس نے دبے قدموں میرے بند دروازے کے پاس آ کر کان لگا کر سنا اسے میرے پڑھنے کی آواز بھی نہیں سنائی دی۔ وہ دروازے پر ہاتھ لے گئی۔ جیسے کھول کر دیکھنا چاہتی ہو۔ پھر رک گئی۔ میں پردے کے پیچھے سے واضح طور پر اسے شرماتے دیکھ رہا تھا۔ حیا اجازت نہیں دے رہی تھی کہ دروازہ کھولے یا دستک دے۔

آخر وہ سر جھکا کر سوچتی ہوئی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی۔ وہاں سے پھر میرے بند دروازے کو دیکھا۔ میں سمجھتا تھا کہ میں ہی ایک ہاتھ سے تالی بجانے والی حماقت کر رہا ہوں مگر وہ بھی اپنے کمرے میں میری ہی طرح بے چین رہتی تھی۔ اس نے اپنا دوپٹہ اتار کر بستر پر پھینک دیا۔ اسی وقت میں نے پردے کے پیچھے سے نکل کر دروازے کو اندر سے بند کیا تو آواز سنتے ہی وہ چونک کر پلٹ گئی۔ مجھے دیکھتے ہی دونوں ہاتھوں سے اپنے منہ کو دبا لیا۔ اس دباؤ میں حیرت کی چیخ گھٹ کر رہ گئی۔

وہ اگلے ہی لمحے میں سنبھل گئی۔ تعجب سے بولی "کزن! یہ کیا حرکت ہے؟"

میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "اس حرکت میں محبت ہی محبت ہے۔"

اس نے پیچھے ہٹ کر کہا "وہیں رک جاؤ۔ میری آواز اونچی ہو گی تو بات بڑوں تک پہنچ جائے گی۔"

میں رک گیا پھر بولا "بات بڑوں تک نہ پہنچے اسی لئے میں نے دروازہ بند کیا ہے۔"

"تم دروازہ بند کر کے میری اور میرے والدین کی توہین کر رہے ہو۔ ہوش میں آؤ۔ امی اور ابا نے تم پر اعتماد کیا ہے۔ وہ تمہاری نیکی اور شرافت کی قسمیں کھاتے ہیں۔ فوراً دروازہ کھولو۔"

"تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے میں شیطان ہوں اور تم پارسا ہو۔ کل سے مجھے بھڑکا رہی ہو۔ بارش میں بھیگ بھیگ کر آگ لگا رہی ہو۔"

"تم مجھے الزام دے رہے ہو۔ میں کام کرتے وقت مجبوراً بھیگ رہی تھی۔ مجھے یہ سوچ کر شرم آ رہی ہے کہ تم مجھے تماشا سمجھ کر دیکھ رہے تھے۔ اگر میرے ذہن میں گندگی ہوتی تو تمہیں کل رات وارننگ نہ دیتی۔"

"دیکھو شاہدہ! جھوٹ نہ بولو۔ تم میرے لئے بے چین رہتی ہو۔ مجھے پانے کے لئے تڑپتی ہو۔ ابھی میں نے اپنے بند دروازے کے پاس تمہاری بے چینی دیکھی ہے۔"

وہ التجا آمیز لہجے میں بولی "کزن! مجھے غلط نہ سمجھو۔ میں محبت سے شرارتیں کرتی ہوں۔ تمہیں دل و جان سے چاہتی ہوں۔ تمہیں نہیں دیکھتی ہوں تو بے چین ہو جاتی ہوں۔"

"میں یہی بے چینی دور کرنے آیا ہوں۔"

میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی پکڑ لی۔ وہ چھڑانے کی کوشش کرتی ہوئی بولی "خدا کے لئے ہاتھ نہ لگاؤ۔ میں تمہاری امانت ہوں۔ اپنے بزرگوں سے کہو' مجھے مانگنے آئیں۔ مانگنے سے میرے میکے کی عزت بڑھے گی۔ ورنہ میں دو کوڑی کی ہو جاؤں گی۔"

میں نے ہاتھ کھینچ کر گرفتار کیا۔ یوں لگا میرے سینے سے آ کر آگ لپٹ گئی ہے۔ اس نے پوری قوت لگائی۔ بڑی جان دار تھی۔ میں جھٹکا کھا کر دو قدم پیچھے گیا۔ میرے اندر سے آتش فشاں پھٹ پڑا تھا۔ میں ہوش میں نہیں تھا۔ پھر اس کی طرف لپکا۔ قریب پہنچتے ہی اس کا ہاتھ چل گیا۔ میرے منہ پر ایک زور دار تھپڑ پڑا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دونوں ہاتھوں سے دھکا دیا۔ میں چونکہ جنون میں تھا اس لئے توازن قائم نہ رکھ سکا۔ دھکا کھا کر گرتے گرتے پلنگ کے پائے سے ٹکرا گیا۔ پیشانی پائے سے لگی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ میں نے فرش پر گرتے ہوئے اتنا ہی دیکھا کہ وہ دروازہ کھول کر راہداری میں پہنچ گئی تھی۔ پھر میرا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

پتا نہیں میں کتنی دیر اپنی زندگی سے' اپنے وجود سے غافل رہا۔ شاہدہ کے لئے پرابلم بن گیا تھا۔ وہ مجھے میرے کمرے میں نہیں پہنچا سکتی تھی اور اپنے کمرے میں رات بھر نہیں رکھ سکتی تھی۔ وہ تو میرے قریب آنے سے بھی ڈر رہی تھی _ آخر وہ غسل خانے سے ایک چھوٹی بالٹی میں پانی بھر کے لے آئی۔ پھر کچھ فاصلے سے میرے منہ پر تمام پانی پھینکا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ بالٹی پھینک کر بھاگتی ہوئی پھر راہداری میں چلی گئی۔ وہاں سے

مجھے دیکھنے لگی- میں نے سوچا "میں کہاں ہوں؟ کس حال میں ہوں؟ یہ شاہدہ راہداری میں کیوں کھڑی ہے؟"

پھر اچانک یاد آگیا کہ یہ شاہدہ کا کمرا ہے اور میں جوانی کی برسات میں نہیں، سامنے پڑی ہوئی بالٹی کے پانی سے بھیگا ہوا ہوں- میں نے غصے سے اسے دیکھا- مجھے طمانچہ یاد آ گیا تھا- اس نے، اس لڑکی نے مجھے مارا تھا! میں اس کا جبڑا پکڑ لوں تو منہ سے ماں کا دودھ نکل آئے گا- یہ کیا شے ہے میرے سامنے؟

میں طیش میں آ کر کھڑا ہوا- وہ راہداری میں ایک قدم آگے بڑھا کر بھاگنے کے لئے تیار ہو گئی- میں پیشانی سے بہنے والے لہو کی گرمی اپنے چہرے پر پھیلتی ہوئی محسوس کر رہا تھا- میں اسے پکڑنے کے انداز میں ہاتھ بڑھاتے ہوئے دروازے پر آیا- وہ بھاگتی ہوئی اپنی ماں کے دروازے کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی-

میں نے راہداری میں آ کر اسے غراتے ہوئے دیکھا- اس نے دروازے کے ہینڈل پر اس انداز سے ہاتھ رکھا جیسے خاموش دھمکی دے رہی ہو کہ میں اسے پکڑنے آؤں گا تو وہ دروازہ کھول کر ماں باپ کے پاس چلی جائے گی یا انہیں نیند سے جگا دے گی-

میں دونوں مٹھیاں بھینچ کر اسے بے بسی سے دیکھا پھر گھوم کر اپنے دروازے پر آیا- اسے دیکھا، وہ بھی دیکھ رہی تھی- میں نے ہاتھ کے اشارے سے بلایا اس نے انکار میں سر ہلا دیا- میں طمانچے کا جواب طمانچے سے نہیں دے سکتا تھا- کیا مجبوری تھی کہ اسے گالیاں بھی نہیں دے سکتا تھا لیکن نفرت ظاہر کئے بغیر آرام نہیں آسکتا تھا-میں نے اس کی طرف تھوک دیا- تھوک وہاں تک نہیں پہنچا- میں نے کمرے میں پہنچ کر دروازے کو اندر سے بند کر لیا-

جذبات کی کتنی اونچی اڑان تھی اور کتنا نیچے آ کر گرا تھا اس وقت یہ سمجھ نہیں سکتا تھا کہ مجھے غصہ کس بات پر آ رہا ہے؟ ایک عورت سے طمانچہ کھانے پر؟ چہرہ لہولہان ہونے پر؟ یا ساون بھرے زرخیز بدن کو حاصل کرنے میں ناکام ہونے پر؟ یا مجموعی شکست پر تلملا رہا تھا؟

میں بڑی دیر تک میز کے پاس بیٹھا پیچ و تاب کھاتا رہا- ساتھ ہی قسم بھی کھاتا رہا کہ اسے نہیں چھوڑوں گا- اپنی بے عزتی اور ناکامی کو نہیں بھولوں گا- آج رات کے ایک ایک لمحے کا حساب اس سے لوں گا-

میں نے باتھ روم میں آ کر لائٹ آن کی- آئینے میں پیشانی کے زخم کو دیکھا- چہرے سے خون صاف کیا- زخم سے اب تک لہو بہہ رہا تھا- میں نے رومال کے ایک حصے کو آفٹر شیونگ لوشن میں بھگو کر زخم پر لگایا- تکلیف کی شدت سے کراہنے لگا- تکلیف تو ہوئی لیکن لہو کا رسنا بند ہو گیا-

میں نے غصے میں کئی بار سوچا کہ بے عزتی اٹھانے کے بعد اب اس گھر میں نہیں رہنا

چاہئے لیکن عقل بھی سمجھاتی رہی کہ ماں کی محبتیں دینے والی چاچی اور باپ کی کمی پوری کرنے والا چاچا کیا سوچے گا- جب تک اس گھر سے جانے کی معقول وجہ نہ ہو، نہیں جانا چاہئے- وہیں رہ کر شاہدہ کو منہ توڑ جواب دینے کا موقع تلاش کرنا چاہئے-

اس رات بستر پر کانٹے چبھ رہے تھے- میں غصے سے کرسی پر بیٹھا رہا- رات کے تین بج گئے پھر صبح کے پانچ بجنے لگے- فجر کی اذان ہوئی تو میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا- مجھے نماز کے لئے جانا تھا- اس وقت خیال آیا، میں پاک نہیں ہوں- میرے اندر وہ ناپاکی، وہ غلاظت ہے جسے صرف خدا جانتا ہے اور خدا صرف جسم کی طہارت کو قبول نہیں کرتا- اس کے ساتھ نیت کی پاکیزگی بھی لازمی ہے- بہت عرصے بعد میں نے فجر کی نماز چھوڑ دی- لباس تبدیل کیا- ایک کتاب، ایک کاپی اور ایک قلم لیا- دروازہ کھول کر راہداری میں آیا- شاہدہ اور چاچی کے کمروں کے دروازے بند تھے- میں دبے قدموں چلتا ہوا باہر کا دروازہ کھول کر برآمدے میں آیا- وہاں میری موٹر سائیکل کھڑی تھی- میں نے پیچھے کیریئر پر کتاب اور کاپی کو رکھنا چاہا تو وہاں ایک تہ کیا ہوا کاغذ رکھا تھا- میں نے اسے اٹھا کر کھولا- بڑے سائز کے کاغذ پر بہت کچھ لکھا ہوا تھا- نیچے شاہدہ کا نام پڑھ کر میں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں- تمام کھڑکیاں اور دروازے بند تھے- وہ نامہ لکھنے والی نظر نہیں آئی- میں نے اسے جیب میں رکھ لیا- موٹر سائیکل کو برآمدے سے اتار کر اسے کھینچتا ہوا احاطے کے گیٹ تک آیا تاکہ موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے کی آواز پر چاچا اور چاچی بیدار نہ ہو جائیں- باقی وہ خط بتا رہا تھا کہ شاہدہ شب بیداری کرتی رہی ہے-

میں موٹر سائیکل ڈرائیو کرتا ہوا بازار آیا- ایک لسی کی دکان پر گاڑی روکی- پھر لسی کا آرڈر دے کر وہ خط پڑھنے لگا- اس نے لکھا تھا "کزن! تم ایسے تو نہ تھے- تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ پانچوں وقت اللہ تعالیٰ کے آگے جھکتے ہو، عبادت میں پاکیزگی کو سمجھتے ہو- پھر محبت میں پاکیزگی کو کیوں نہیں مانتے؟

"کزن! میں صرف تمہاری ہوں- مجھے عزت و آبرو سے اپنا لو- رسم و رواج کے مطابق اپنی دلہن بنا لو- اس سے پہلے مجھ پر حرف نہ لاؤ- مجھے میری ہی نظروں سے نہ گراؤ-

"رات جو کچھ ہوا- اس پر میرا دل کڑھ رہا ہے- میرا ہاتھ بے اختیار تم پر اٹھ گیا تھا- میں اپنا یہ ہاتھ سنبھال کر رکھوں گی- شادی کے بعد اسے توڑ دینا- ابھی کچھ دنوں کی بات ہے، تم بہت بھولے تھے- میں دل ہی دل میں تمہاری شرافت پر قربان ہوتی رہتی تھی لیکن کالج کے ماحول نے تمہاری شرافت اور معصومیت کو مجروح کیا ہے- مجھے یہ بات اس وقت یقین سے معلوم ہوئی جب میں نے تمہارے کوٹ کی جیب سے وہ خط نکالا جسے تم اپنے ابا کے نام پوسٹ کرنے والے تھے- میں نے اسے کھول کر پڑھا تو حیران رہ گئی- وہ خط نہیں تھا- تمہارے خیالات تھے- اس میں لکھا ہوا تھا- چچا کی بیٹی کو کیا کہا جاتا ہے؟ پھر

اس کا جواب لکھا ہوا تھا- چچا کی بیٹی بچپن میں بہن اور جوانی میں کزن ہوتی ہے-"

میں نے چونک کر سوچا' وہ بہن اور کزن والی تحریر تو میں نے جلا دی تھی- دکاندار نے لسی کا گلاس بڑھاتے ہوئے مجھے مخاطب کیا- میں گلاس لے کر پینے لگا- خط کے سلسلے میں جو گڑبڑ ہوئی وہ سمجھ میں آ گئی- میں نے غلطی سے اپنے ابا کو لکھا ہوا خط جلا دیا تھا- وہ تحریر جوں کی توں کوٹ کی جیب میں رہ گئی تھی جو بعد میں شاہدہ کے ہاتھ لگ گئی-

میں نے جلدی سے گلاس خالی کیا- لسی کی قیمت ادا کی پھر موٹر سائیکل پر بیٹھ کر شاہدہ کے خط کو آگے پڑھنے لگا- آگے لکھا ہوا تھا "کزن! وہ تحریر پڑھ کر معلوم ہو گیا کہ تمہاری معصومیت ختم ہو چکی ہے- تم کزن کے رشتے سے ملنے والی رعایت کے مطابق مجھ سے شادی بھی کر سکتے ہو اور کوئی جذباتی غلطی بھی-

"اگرچہ وہ تمہارے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر نہیں تھی- میں تمہاری ہینڈ رائٹنگ پہچانتی ہوں لیکن اس تحریر کا تعلق تم سے اور چچا کی بیٹی سے یعنی مجھ سے تھا- میں نے سوچا کہ تم میں اتنی جرات نہیں ہوگی کہ اپنے ابا سے مجھے مانگ لینے کو کہہ سکو- اگر میں اس تحریر کے نیچے تمہارا نام لکھ کر اسے تمہارے ابا کے نام پوسٹ کردوں تو وہ میرے متعلق اپنے بیٹے کی پسند کو سمجھ لیں گے- وہ بھی مجھے بہو بنانا چاہیں گے تو پھر جلد ہی رشتے کی بات چل پڑے گی-"

میں نے شاہدہ کے خط کو مٹھی میں بھینچ کر دل میں کہا "باپ رے- یہ شاہدہ نے ابا تک اسے پہنچا دیا ہے اب کیا ہوگا؟ آج کل میں اس کا جواب آتا ہی ہوگا-"

میں جانتا تھا- میری پسند ابا کی پسند ہوگی لیکن جس انداز سے یہ بات وہاں تک پہنچنے والی تھی یا پہنچ گئی تھی اس سے شرم اور جھجک سی ہو رہی تھی کہ امی اور ابا کا سامنا کیسے کروں گا؟

یہ درست ہے کہ میں شاہدہ کو دلہن بنا کر لانے کا معاملہ مہینوں اور برسوں تک ٹال دیتا- اب یہ معاملہ ٹلنے والا نہیں تھا- اس سلسلے میں میری امی رکاوٹ بن سکتی تھیں کیونکہ وہ اپنی بہن کی بیٹی کو میری دلہن بنانا چاہتی تھی لیکن ڈاک کے ذریعے پہنچنے والی یہ تحریر ثابت کرے گی کہ میں بھی امی کے فیصلے کے خلاف چچا کی بیٹی کو پسند کرتا ہوں-

ایک بات کھٹک رہی تھی- شاہدہ اپنی حرکتوں سے مجھ پر حاوی ہو رہی تھی- میں جو چاہتا تھا' وہ ہونے نہیں دیتی تھی- خود جو چاہتی تھی وہ کر گزرتی تھی- جس رات بارش میں بھیگ رہی تھی اس رات اس نے آنکھیں دکھائی تھیں جیسے میں اس سے ڈرتا ہوں مگر حالات سے مجبور ہو کر ڈر گیا تھا- وہ موقعے سے فائدہ اٹھانا جانتی تھی اور کسی نہ کسی طرح اپنا پلڑا بھاری رکھ کر مجھے اپنے دباؤ میں رکھتی تھی- پچھلی رات وہ ہار جاتی لیکن ہارنا نہیں جانتی تھی- ایسا وقت آنے سے پہلے اس نے مجھے زخمی کر دیا- میری شہ زوری کو کمزوری میں اور کامیابی کو ناکامی میں بدل دیا- یہ ان عورتوں میں سے تھی جو مرد پر حکومت کرتے

رہنے کے لئے شادی سے پہلے اس پر دباؤ ڈالنے لگتی ہیں-

اس نے وہ تحریر ڈاک کے ذریعے ابا کے پاس بھیج کر بہت چالاکی دکھائی تھی- جس طرح اب تک ہر معاملے میں مجھ پر دباؤ ڈالتی رہی تھی' اس تحریر کے ذریعے بھی دباؤ ڈال کر دلہن کے روپ میں حکومت کرنے کا منصوبہ بنا چکی تھی اور اس پر عمل کر چکی تھی لیکن اس طرح اس نے مجھے بھی چالاکی سکھا دی تھی- میں اسے اپنے حواس پر اور اعصاب پر سوار نہیں کرنا چاہتا تھا- میں نے بھی فیصلہ کر لیا کہ اسے شیرنی بن کر آنے نہیں دوں گا- شادی سے پہلے ہر طرح اپنے دباؤ میں رکھوں گا- پھر اسے شیرنی سے بکری بنا کر شادی کروں گا-

میں نے ڈاکٹر سے پیشانی کے زخم کی مرہم پٹی کرائی- کالج جانے کو جی نہیں چاہتا تھا- راستوں میں' بازاروں میں کوئی جوان لڑکی نظر آتی تو وہ شاہدہ لگتی تھی- یہ عجیب بات تھی کہ مجھے کسی دوسری لڑکی میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی- میں کسی کے حسن و شباب کو دیکھ کر یونہی شغل کے طور پر اس کی طرف مائل ہونا چاہتا تھا تو دل کہتا تھا کہ یہ کزن کے مقابلہ میں خاک بھی نہیں ہے-

شاہدہ کے معاملے میں بہت سے عوامل کارفرما تھے- ایک تو وہ رفتہ رفتہ حواس پر چھا گئی تھی- پھر میں نے جتنا قریب سے اس کے جلوے دیکھے تھے اتنا قریب کوئی دوسری نہیں آئی تھی- پھر وہ میری ضد بن گئی تھی- یہ بات میرے ذہن میں راسخ ہو گئی تھی کہ شادی سے پہلے اسے نہ توڑ سکا' اس کی برتری ختم نہ کر سکا تو پھر ہرگز شادی نہیں کروں گا-

شام کو گھر آیا تو چاچی اور چاچا ناراض ہونے لگے- صبح میں ناشتا کئے بغیر چلا گیا تھا- وہ میرے لئے پریشان ہو رہے تھے- میری پیشانی پر کراس پٹی دیکھ کر اور پریشان ہو گئے- میں نے تسلی دی- جھوٹ کہہ دیا کہ موٹر سائیکل سے گر پڑا تھا لیکن معمولی چوٹ آئی ہے-

شاہدہ دور ہی دور سے مجھے دیکھ رہی تھی- دیکھنے کا انداز ایسا تھا جیسے میرے چہرے پر اپنے خط کا جواب پڑھنا چاہتی ہو- میں نے اسے لگاوٹ سے نہیں دیکھا- اسے نظر انداز کرنے کی کوششیں کرتا رہا مگر وہ الو کی پٹھی نظروں سے گرتی بھی نہیں تھی- ایسی پیاری لگتی تھی کہ دل میں گھستی آتی تھی-

عورت کی یہی کشش مرد کو اس کا مرید بناتی ہے- جو جلوہ ہائے حسن و شباب کی تابانی اور اداؤں کی دلربائی سے نکل آتا ہے' وہی مرد میدان ہوتا ہے- وہ اگلی صبح میرے کمرے میں ناشتا لے کر آئی- ٹرے میز پر رکھنے لگی- میں کھلے ہوئے دروازے کو دیکھا- راہداری میں کوئی نہیں تھا- میں نے آہستگی سے کہا "تمہارے خط کا جواب دینا چاہتا ہوں-"

وہ سر جھکا کر بولی "میں سن رہی ہوں-"

"ابھی نہیں- رات کو جواب دوں گا-"

اس نے ایک دم سے گھبرا کر دیکھا- پھر جلدی سے منہ پھیر کر بولی- "مم...... میں

رات کو نہیں آؤں گی۔"

"نہیں آؤ گی تو مختصر سا جواب سن لو۔ ابا تمہیں بہو بنانے آئیں گے لیکن میں شادی سے انکار کر دوں گا۔"

اس نے بڑے دکھ سے مجھے دیکھا۔ پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "کل رات کی غلطی کی اتنی بڑی سزا نہ دو۔ چاہو تو ابھی میرا ہاتھ توڑ دو۔"

"میں تم سے شادی کروں گا تمہارا ہاتھ نہیں توڑوں گا۔ تمہاری غلطی معاف کر دوں گا۔ شرط یہی ہے کہ جب بلاؤں' تب چلی آؤ۔ اس کے آگے کچھ نہ بولو۔ بولو گی تو کچھ نہیں سنوں گا۔"

وہ مشکل میں پڑ گئی۔ سوچتی ہوئی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔ میں ایک فاتح کی شان سے ناشتا کرنے اور چائے پینے بیٹھ گیا۔ میں پہلی بار اسے کمزور بنا کر ایک دوراہے پر لے آیا تھا اور یہی دانائی ہے' کسی کو بھی تابعدار بنانے کے لئے اسے پہلے سے کمزور بناتے رہنا ضروری ہے۔

تمام دن اضطراب میں گزرا۔ رات کو کھانا بھی اچھی طرح کھایا نہ گیا۔ جی چاہتا تھا کہ وقت جلدی گزرے۔ رات گہری ہو' بزرگ سو جائیں' سناٹا چھا جائے تو وہ چھم سے چلی آئے۔ میں نے کھانے کے دوران اسے دیکھا تھا۔ وہ چپ چپ سی تھی۔ وہ کشمکش میں ہو گی اسی لئے کسی سے نہیں بول رہی تھی۔ چاچا کھانے کے بعد اپنے کمرے میں چلے گئے۔ چاچی کچن میں گئیں۔ اس نے جلدی سے میز پر ذرا جھک کر سرگوشی میں پوچھا "تمہاری یہی شرط ہے نا کہ میں رات کو آؤں؟"

میں نے لقمہ چباتے ہوئے کہا "ہاں آج رات کو۔"

"کیا تمہارے کمرے میں آؤں۔"

"اور نہیں تو کیا میدان میں ملو گی؟"

"میں آؤں گی تو تم شادی سے انکار نہیں کرو گے؟"

"تم میرا حکم مانتی رہو گی تو ضرور شادی کروں گا۔"

"اپنی امی اور ابا کی قسم کھا کر کہو۔ آج آؤں گی اور جب بلاؤ گے تب آؤں گی تو جلد سے جلد شادی کرو گے۔"

میں نے امی اور ابا کی قسم کھا کر یقین دلایا کہ جلد سے جلد اسے دلہن بنا کر لے جاؤں گا۔ وہ اٹھ کر ماں کے پاس کچن میں جانے لگی۔ میں نے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ دل میں اعتراف کیا' وہ جاتی ہے تو سانس جاتی ہے' آتی ہے تو سانس آتی ہے۔ بڑی حیات پرور ہے' اسے ضرور شریک حیات بناؤں گا اور اس سے پہلے تابعدار بننے کی ٹریننگ دیتا رہوں گا۔

کھانے کے بعد میں کمرے میں آ گیا۔ وہ ماں بیٹی کچن کی صفائی کر رہی تھیں۔ برتن دھو

رہی تھیں۔ معشوق نے ملنے کا وعدہ کیا ہو تو انتظار سب سے بڑی سزا بن جاتا ہے۔ میں دکھاوے کے لئے دروازہ کھول کر پڑھنے بیٹھ گیا تھا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد گھر میں گہری اور پر اسرار خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس کمرے میں وہ فلم چلنے والی تھی' میں تصور میں اس کا نمونہ دیکھنے لگا۔ اس نمونے میں ساون کے گیتوں والی حسینائیں بھی جھلک رہی تھیں اور ہر حسینہ شاہدہ کا بدن چرا کر اپنے بدن پر سجا رہی تھی۔ اس دیوانگی کو کیا کہئے کہ ہر سو وہی ایک بدن انگڑائیاں سا لیتا تھا۔

بڑی دیر ہو گئی۔ میں نے دروازے پر آ کر دیکھا۔ پورا گھر خاموش تھا۔ راہداری ویران تھی۔ تمام کمروں کے دروازے بند تھے۔ ایسے میں اس دروازے کے پیچھے ہلکی سی آہٹ سنائی دی۔ آہٹ نے دل دھڑکا دیا۔ در پہ نظر گئی۔ وہ ذرا سا کھلا تھا۔ وہ ذرا سی جھلک رہی تھی۔ اس کا یوں آنا' ہائے کیا آنا تھا' صبر کو آزمانا تھا۔

دروازہ اور ذرا سا کھل گیا۔ اس کا گورا گورا گلابی گلابی چہرہ نگاہوں کے سامنے کھل گیا۔ اس نے سفید بے داغ لباس پہنا تھا۔ سفید دوپٹہ سر اور چہرے کے اطراف یوں بندھا ہوا تھا جیسے لڑکیاں نماز پڑھتے وقت باندھتی ہیں۔ پھر وہ دروازہ پوری طرح کھل گیا۔ پوری طرح اس سے آمنا سامنا ہو گیا۔ سامنا ہوتے ہی میں ایک دم سے گھبرا گیا۔ یہ مردانہ ارادہ تھا کہ آگے بڑھ کر اسے حاصل کروں گا لیکن پیچھے ہٹ گیا۔ وہاں کسی تیسرے کا خوف نہیں تھا۔ مجھے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔ مجھے ایک فاتح کی شان سے آگے بڑھنا تھا لیکن پیچھے ہٹنے کے بعد ایک اور قدم پیچھے ہٹ گیا۔

میں الٹے پاؤں کمرے میں آیا۔ وہ سیدھے پاؤں میرے دروازے پر آئی۔ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "یہ ...... یہ کیا حرکت ہے؟ وا ...... واپس جاؤ۔ اسے اپنے کمرے میں رکھ کر آؤ۔"

اس کے سینے پر ایک چھوٹے سائز کا کلام پاک تھا جسے اس نے دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔ وہ نہایت ہی دھیمے اور ٹھنڈے لہجے میں بولی۔ "میں نے وعدہ کیا تھا۔ رات کو آؤں گی۔ تمہارے کمرے میں آؤں گی۔ سو آ گئی۔"

وہ آگے بڑھی۔ میں نے پیچھے ہٹ کر کہا "ہاں ...... مگر ...... مگر یہ ......"

"تم نے اگر مگر کی کوئی شرط نہیں رکھی تھی۔ صرف آنے کو کہا تھا۔"

"ہاں مگر تم چالاک ہو۔ تم میری نیت کو سمجھ کر آئی ہو۔"

"ہاں' سمجھ کر آئی ہوں اس لئے یہ کتاب لائی ہوں۔ تم کل تک اسے روز صبح پڑھتے تھے اور برسوں کی پڑھائی آج رات بھول گئے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ تم اس کا احترام کر رہے ہو اور خدا سے ڈر رہے ہو۔"

میں پیچھے جاتے جاتے الماری سے لگ گیا تھا۔ منہ پھیر کر بولا۔ "اسے لے جاؤ پھر آ کر میری بات سنو۔"

"شادی سے پہلے جب بھی آؤں گی اس کتاب کے ساتھ آؤں گی۔"

میں نے جھلا کر کہا "بکواس مت کرو۔ مجھے الو بناتی ہو اور شادی کا خواب دیکھتی ہو۔"

"کیا خواب؟ تم نے اپنی امی اور ابا کی قسم کھا کر وعدہ کیا تھا کہ میں رات کو تمہارے کمرے میں آؤں گی تو تم جلد سے جلد شادی کرو گے۔"

مجھے بھولی ہوئی قسم یاد آئی۔ میں نے اسے شدید حیرانی سے دیکھتے ہوئے سوچا۔ "یہ لڑکی بہت خطرناک ہے۔ زبردست مکاری سے مجھے ماں باپ کی قسم کھلائی ہے۔ اب ایسے آئی ہے کہ میں اس کی آمد سے نہ انکار کر سکتا ہوں اور نہ اپنی قسم کو جھوٹی کہہ سکتا ہوں۔ جو لڑکی شادی سے پہلے اس طرح گھیر سکتی ہے وہ شادی کے بعد جانے کیسے کیسے نامعلوم شکنجوں میں کستی رہے گی۔

میں نے مٹھیاں بھینچ کر اور دانت پیس کر کہا "میرے اندر دھواں بھر گیا ہے۔ دماغ جل رہا ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے چلی جاؤ' ورنہ میں پھٹ پڑوں گا۔ پاگل ہو جاؤں گا۔ دیواروں سے سر ٹکرانے لگوں گا۔"

بولتے بولتے میری آواز تیز ہو رہی تھی۔ وہ اس خیال سے جانے لگی کہ میری آواز سن کر اس کے والدین نہ آ جائیں۔ میری یہ حالت تھی کہ میں ہوش سے بیگانہ ہو رہا تھا۔ خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا وہ جا چکی تھی مگر برسات میں بھیگتا ہوا بدن میری آنکھوں کے سامنے آ آ کر ٹکریں مار رہا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیوار پر گھونسا مارتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن آنکھیں بند کرنے سے بلا نہیں ٹلتی۔ تصور میں اور زیادہ بھڑکتی ہے۔ میرے اندر شعلے بھڑک رہے تھے۔ وہ وہ دیکھو۔ وہ بارش میں پھسل رہی ہے۔ برسات میں بدن بول رہا ہے۔ بجلی کی طرح چمک رہا ہے۔ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح میرے ہاتھوں میں آ رہا ہے۔ آ رہا ہے یہ ...... یہ آ رہا ہے۔ مگر نہیں آیا۔ پتنگ واپس چلی گئی۔

میں ایک دم سے پھٹ پڑا بے اختیار حلق پھاڑ کر چیخنے لگا "نہیں' نہیں' ہا ہا ہا ہا۔ ہا ہا ہا ہا۔ دم دما دم برسات میں۔ ہا ہا ہا ہا۔ دم دما دم برسات میں ......

مجھے کچھ کچھ سمجھ میں آ رہا تھا کہ میں اپنے اختیار میں نہیں ہوں۔ کبھی میز سے کبھی الماری سے اور کبھی دیواروں سے ٹکرا رہا ہوں۔ میں نے چاچا اور چاچی کی دھندلی سی جھلک بھی دیکھی۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔ پتا نہیں میں کن اندھیروں میں کھو گیا تھا۔ اگر پھٹ پڑتا تو زندگی تمام ہو جاتی۔ پھر نہ حسن ہوتا' نہ شباب ہوتا' رات ہوتی نہ برسات ہوتی۔ میں پچھلی نیکیوں اور موجودہ گناہوں کے ساتھ مٹی میں دفن ہو جاتا۔

ابھی زندگی تھی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ کسی اسپتال کا کمرا تھا۔ چاچی کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ "اسے ہوش آگیا ہے' ڈاکٹر کو بلائیں۔"

میں نے چاچا کو کمرے سے باہر جاتے دیکھا۔ چاچی نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے میرے بچے نے آنکھ کھولی ہے۔ میں سات دیگوں

کی نیاز دلاؤں گی۔"

میں بہت سکون محسوس کر رہا تھا۔ دماغ ہر سوچ سے خالی تھا۔ میں نے خالی خالی نظروں سے چاچی کو دیکھا۔ وہ بولیں۔ "ڈاکٹر کہتا ہے تمہارے دماغ پر بہت بوجھ پڑا ہے۔ بیٹے! اتنا نہ پڑھا کرو۔ آگ لگا دو ایسی موٹی موٹی کتابوں کو جو پڑھنے والے کو پاگل بنا دیتی ہیں۔"

چاچا ڈاکٹر کے ساتھ آئے۔ ان کے پیچھے نرس اور وارڈ بوئے بھی تھے۔ ڈاکٹر نے میرے شانے کو تھپک کر کہا۔ "ہیلو مائی بوائے! تم تو بہت حوصلے والے ہو۔ دیکھو بالکل نارمل ہو۔ ہونا؟"

میں نے پلکیں جھپک کر کہا "جی ہاں' تھینک یو ڈاکٹر۔"

وہ معائنہ کرتے ہوئے بولا۔ "کیا مجھ سے باتیں کرو گے؟"

"ضرور کروں گا۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "پلیز' آپ سب تھوڑی دیر کے لئے باہر جائیں۔"

چاچا' چاچی' نرس اور وارڈ بوائے وغیرہ باہر چلے گئے۔ ڈاکٹر نے کہا "میں دماغی امراض کا معالج ہوں۔ مجھ سے کچھ نہ چھپانا۔ جس قدر کھل کر گفتگو کرو گے اتنا ہی علاج آسان ہو گا۔"

"میں کچھ نہیں چھپاؤں گا۔"

"تم اچانک ایب نارمل کیوں ہو گئے تھے۔ تمہارے بزرگ کہتے ہیں پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے ایسا کیوں ہوا؟ مجھے ایسا لگا تھا جیسے میرے سر میں انگارے بھر گئے ہیں۔ اگر میں زور سے نہیں چلاؤں گا تو دماغ پھٹ جائے گا۔ مجھے یاد آ رہا ہے کہ میں چیخنے لگا تھا اور بے اختیار دیوار اور الماری سے ٹکرا رہا تھا۔ ایک بار میں نے چاچا اور چاچی کی موجودگی کو بھی سمجھا پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔"

"یہ تم کیفیت بتا رہے ہو۔ وجہ بتاؤ۔ تم کہتے ہو تمہارے سر میں انگارے بھر گئے تھے۔ کیوں بھر گئے تھے؟ وہ کیا بات ہے' جو ایب نارمل ہونے کی محرک بنی؟"

"ڈاکٹر! مرض کی وجہ ہر مریض نہیں جانتا۔ مرض کیوں لاحق ہوتا ہے اس کی تشخیص ڈاکٹر کرتا ہے۔"

"میں سمجھ گیا تم بتانا نہیں چاہتے۔"

"کوئی بات ہوتی تو ضرور بتاتا۔"

کیسے بتاتا؟ کیا میں اس جرم کا اعتراف کرتا کہ میرے اندر کی بارود سے کسی شریف زادی کی دھجیاں نہیں اڑیں' مجھ دہشت گرد کے پرزے اڑ گئے اور میں تو اسے شریف زادی مان نہیں سکتا تھا۔ اس نے ایک رات مجھے لہو لہان کیا تھا۔ دوسری رات اسپتال پہنچا

دیا تھا۔

ڈاکٹر نے کچھ سوچ کر پوچھا۔ "تمہارے خاندان میں کبھی کوئی ایب نارمل رہا ہے۔"

میں نے کہا "جی ہاں' میرے دادا آخری تین برسوں میں دماغی مریض رہے۔ ایک ماہ تک مینٹل اسپتال میں رہے۔ پھر انہیں پاگل خانے منتقل کر دیا گیا۔

ڈاکٹر نے چاچا کو بلا کر پوچھا۔ انہوں نے تصدیق کی۔ پھر ڈاکٹر نے کہا "فی الحال تشویش کی بات نہیں ہے لیکن احتیاط لازمی ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ایسا دورہ پھر نہ پڑے تو ان کے دادا کی مکمل میڈیکل رپورٹ اور نفسیاتی تجزیے کی تفصیلی رپورٹ بھی لے آئیں۔ انہیں ابھی پر سکون رہنے کی دوائیں دی جا رہی ہیں۔ اگر نیند آئے تو سونے دیں۔ ورنہ ہنستے بولتے رہیں تاکہ ان کا دل بہلتا رہے۔"

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ چاچی اور چاچا ہنس بول کر میرا دل بہلائیں۔ میرے دل بہلانے کا سامان یہ بزرگ گھر چھوڑ آئے تھے اور میں اس سامان کے متعلق سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ ڈاکٹر نے جو سکون کی دوائیں دی تھیں ان سے دماغ کی گرمی اور جذباتیت ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔ جہاں جنون ہو' وہاں سکون نہیں ملتا اور جب سکون مل جائے تو جنون سرد پڑ جاتا ہے۔ میں بڑے آرام سے سو گیا۔

امی اور ابا اطلاع ملتے ہی چلے آئے۔ امی دعائیں مانگتی ہوئی اسپتال کے کمرے میں آئیں۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے روتے ہوئے مجھے گلے سے لگایا۔ مجھے چومتے ہوئے پوچھا۔ "ماں کی جان! تجھے کیا ہو گیا تھا؟ کس دشمن کی نظر لگ گئی تھی؟ تو صبح سے آدھی رات تک پڑھتا کیوں ہے؟ ان کتابوں کی گرمی نہیں چڑھے گی تو اور کیا ہو گا۔"

ابا نے امی سے کہا۔ "زینت! کتابوں میں گرمی نہیں ہوتی' وہ ذہانت کے لئے تازہ ہوا کا جھونکا ہوتی ہیں۔ کتابیں ڈاکٹر پیدا کرتی ہیں مریض نہیں۔ بیٹے کے سامنے زیادہ نہ بولو۔ ڈاکٹر کی ہدایات یاد رکھو۔"

چاچا نے فون کے ذریعے ابا سے کہہ دیا تھا کہ وہ دادا جان کی میڈیکل رپورٹ لے آئیں۔ انہوں نے وہ رپورٹ لا کر ڈاکٹر کو دی تھی پھر مجھ سے تنہائی میں پوچھا۔ "کیا بات ہے بیٹے؟ تم تو بہت ٹھنڈے مزاج کے تھے پھر دماغ میں گرمی کیسے چڑھ گئی؟ کالج میں کسی سے جھگڑا ہوا تھا؟ تمہارا چاچا کہتا ہے تم یہ پیشانی کا زخم کالج سے لے کر آئے تھے۔ اگر کسی نے تمہاری توہین کی ہے' تمہاری خود داری اور برتری کو ٹھیس پہنچائی ہے تو اس کا نام اور پتا بتا دو۔ میں اس کی لاش تمہیں دکھا کر سکون پہنچاؤں گا۔ اپنے باپ سے کچھ نہ چھپاؤ۔"

"ابا! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں خود نہیں سمجھ پا رہا ہوں کہ یہ پاگل پن کا دورہ کیوں پڑا تھا۔"

"بیٹے! ڈاکٹر مجھ سے پوچھ رہا تھا کیا تم عاشق مزاج اور جذباتی ہو۔ میں نے فخر سے کہا کہ میرا بیٹا انتہائی شریف اور صوم و صلوٰۃ کا پابند ہے لیکن ڈاکٹر مجھے کرید رہا تھا۔ کہہ رہا تھا اکثر والدین اپنی اولاد کے معاملے میں ایسے ہی نیک خیالات رکھتے ہیں لیکن جوانی کے پیروں تلے کیلے کا چھلکا ضرور آتا ہے۔ تب مجھے یاد آیا کہ تم شاہدہ کو چاہتے ہو۔"

میں نے چونک کر کہا "نہیں' یہ آپ سے کس نے کہہ دیا؟"

انہوں نے مسکرا کر جیب سے وہی کاغذ نکالا' جس کی تحریر پوچھتی تھی کہ چچا کی بیٹی کو کیا کہتے ہیں؟ پھر جواب بھی لکھا تھا کہ بچپن میں بہن اور جوانی میں کزن کہتے ہیں۔ یعنی وہ

ایسی تحریر تھی جسے باپ کے نام پوسٹ کرنے کے بعد بیٹے اور بھتیجی کا عشق سمجھائے بغیر سمجھ میں آ جاتا تھا۔

انہوں نے وہ کاغذ دکھاتے ہوئے پوچھا۔ "یہ تم نے ہی لکھا ہے؟ انکار نہ کرنا۔ راشنگ تمہاری نہیں ہے۔ تم نے کسی سے لکھوایا ہے۔ اسے میرے پاس بھیجنے کے لئے تم میں اتنی جرات نہیں تھی کہ لفافے پر اپنے ہاتھ سے ایڈریس لکھتے۔ تم نے شاہدہ سے ایڈریس لکھوا کر اسے پوسٹ کرایا۔"

"ابا! آ .... آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔"

"لیکن ڈاکٹر غلط نہیں سمجھ رہا ہے۔ میں نے یہ اسے پڑھایا ہے۔"

میں نے ایک ہاتھ سے سر تھام لیا۔ اسی وقت امی نے کمرے میں آ کر کہا۔ "شاہدہ گھر سے کھانا لائی ہے۔"

میں نے پریشان ہو کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ بڑا سا ٹفن کیریئر اٹھائے امی کے پیچھے کھڑی تھی۔ ابا مسکراتے ہوئے اٹھ گئے۔ امی سے بولے۔ "ادھر آؤ۔ تم سے کچھ کہنا ہے۔"

وہ امی کو باہر لے گئے۔ شاہدہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بیڈ کے پاس آئی۔ سرہانے والی میز کے خانے سے برتن اور چمچے نکالنے لگی۔ میں نے اسے صرف ایک نظر دیکھا تھا پھر سر جھکا لیا تھا۔ میرا سر ندامت کے احساس سے نہیں اپنی شکست کے خیال سے جھکا تھا۔ اس نے مجھے توڑ پھوڑ کر اسپتال پہنچایا تھا۔ یہ ذلت برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

وہ ٹفن کیریئر کھول کر روٹیاں اور سالن پلیٹ میں ڈالتے ہوئے بول رہی تھی۔ "تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔ مجھے غلط نہ سمجھو۔ اسپتال سے گھر آؤ گے تو تمہارے قدموں میں گر جاؤں گی۔ تایا ابا نے میرے ابا کو وہ خط دکھایا ہے جو تم نے لکھا تھا اور میں نے پوسٹ کیا تھا۔ ہمارا رشتہ جلد ہی پکا ہو جائے گا۔ تم نے اپنی امی اور ابا کی قسم کھائی تھی کہ مجھے اپنے گھر کی عزت بناؤ گے۔"

وہ عاجزی سے بولی۔ "خدا جانتا ہے میں نے ...."

میں نے بات کاٹ کر کہا "بکواس مت کرو اور سنو۔ میں پھر اپنی اور ابا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہیں اس بری طرح ذلیل کروں گا کہ سب تمہارے منہ پر تھوکیں گے۔ اسی لمحے سے تمہاری ذلت شروع ہو گی۔ بزرگ سمجھتے ہیں یہ محبت سے لایا ہوا کھانا میں تمہاری میزبانی میں کھاؤں گا۔ نہیں' باہر جاؤ اور انہیں بتا دو کہ میں نے تمہارا لایا ہوا کھانا سونگھنے سے بھی انکار کر دیا ہے۔"

اس کی صورت ایسی ہو گئی تھی جیسے اب تب میں رو پڑے گی۔ میں اس کا ڈسا ہوا تھا۔ مجھے اس پر ترس نہیں آ سکتا تھا۔

اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ ادھر کوئی نہیں تھا۔ وہ جلدی سے ہاتھ جوڑ کر

بولی۔ "ہمارے بزرگ راضی ہیں' سب کے سب خوش ہیں۔ امی کہہ رہی تھیں ڈاکٹر نے بھی فوراً شادی کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ میں ہاتھ جوڑ کر منت کرتی ہوں۔ غصہ تھوک دو۔ میرے منہ پر تھوک دو۔ تنہائی میں خوب انتقام لو مگر مجھے ایک بار اپنا لو' میں تمہاری ساری شکایتیں دور کردوں گی۔"

میں نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ اس نے موسم باراں کی مناسبت سے دھنک لباس پہنا تھا۔ شاید غسل کرتے ہی گھر سے نکل آئی تھی۔ زلفیں بھیگی بھیگی سی تھیں۔ اگر وہ اور قریب ہوتی تو اس کی سانسوں سے برسات کی بھیگی ہوئی ہوا آتی۔ ہزار نفرت کے باوجود مانتا ہوں کہ بڑے ہی نامعلوم طور طریقوں سے اس کی ضرورت میرے اندر پرورش پاتی رہتی ہے۔ میں نے خشک لہجے میں کہا۔ "یہ اپنے دونوں ہاتھ نہ جوڑو۔ میرے ہاتھ سے اپنا ہاتھ جوڑو۔ تمہاری التجا کا یہ انداز دیکھ کر آخری موقع دیتا ہوں۔ شرط وہی ہے۔ وعدہ کرو۔ آج رات ہسپتال میں تم میرے پاس رہو گی۔"

اس نے بے بسی سے پریشان ہو کر مجھے دیکھا پھر کہا "یہ کیا کہہ رہے ہو؟ ہمارے بزرگ کبھی اجازت نہیں دیں گے۔"

"میں کچھ نہیں جانتا۔ اجازت نہ ملے تو گھر سے بھاگ کر آ جاؤ۔ کل رات تم نے دھوکا دیا' مذہب کی آڑ لے کر مجھے بے وقوف بنایا۔ تم اس کی تلافی کیسے کرو گی؟ یہ سوچنا تمہارا کام ہے۔"

وہ سوچتی رہ گئی۔ چند لمحوں تک ایسی گم صم رہی جیسے سولی پر چڑھنے آئی ہو۔ پھر وہ بولی۔ "مجھے سوچنے کی مہلت دو۔ روٹی کھا لو۔"

میں بستر پر کھسک کر سرہانے کے قریب آیا۔ پھر کھانا کھانے لگا۔ وہ بڑی عاجزی سے بولی۔ "تم میرا مزاج اور میری فطرت کو کیوں نہیں سمجھ رہے ہو۔ اگر تمہاری بے جا ضد مان لوں گی تو اپنی نظروں سے گر جاؤں گی۔ میرے اندر کی لڑکی مجھے زندہ رہنے نہیں دے گی۔"

"تم کسی غیر کی نہیں اپنے ہونے والے شوہر کی ضد ماننے والی ہو۔"

"میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ آؤں گی تو پھر کوئی گڑ بڑ ہو جائے گی۔ قدرت کے اشاروں کو اور غائبانہ تنبیہہ کو سمجھو۔ ایک رات زخمی ہوئے۔ دوسری رات ذہنی توازن کھو بیٹھے۔ پتا نہیں تیسری رات کیا ہو جائے گا۔"

"جو ہو گا' اس کی ذمے داری میری ہو گی۔ میں صرف ایک بات جانتا ہوں کہ آج رات تم آؤ گی۔ ورنہ زندگی میں پھر کبھی نہیں آؤ گی۔"

وہ کھانے کے بعد ٹفن کیریئر لے کر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی کچھ بے چینی سی ہوئی۔ ڈاکٹر نے سکون کی دوائیں دی تھیں۔ میں نے پھر اسے رات کو بلا کر بدپرہیزی کی تھی۔ وہ آتی یا نہ آتی لیکن اس کے آنے کا تصور ہیجان انگیز تھا اور یہ موجودہ دواؤں کے

منافی تھا۔

اگر میں صبر کر لیتا۔ اسپتال سے چھٹی کے بعد گھر جاتا اور وہاں اپنی بات منواتا تو میرے لئے بہتر ہوتا لیکن وہ پوسٹ کیا ہوا خط اندیشہ پیدا کر رہا تھا کہ آج کل میں ہمارا رشتہ طے ہو جائے گا۔ پھر وہ اور سر چڑھے گی۔ اسے آج ہی سر سے اتار کر قدموں میں گرانا لازمی ہو گیا تھا۔

شام چھ بجے تک ابا کو میرے پاس رہنا تھا۔ رات نو بجے امی کے آنے کے بعد وہ گھر جا کر آرام کرتے۔ ایک وارڈ بوائے نے آکر کہا۔ "آپ کا فون ہے۔ اٹینڈ کر لیں۔"

ابا یہ کہتے ہوئے گئے کہ تمہاری ماں کا فون ہوگا۔ ابھی آتا ہوں۔ میں سوچنے لگا امی رات کو میرے پاس رہنے آئیں گی تو شاہدہ نہیں آسکے گی۔ ویسے بھی ہمارے بزرگ ہمیں اسپتال کے کمرے میں رات سے صبح کرنے کی اجازت نہ دیتے۔ یہ تو میں نے شاہدہ کو پرابلم میں ڈالا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ مستقبل میں کروڑ پتی چودھرائن بننے کے لئے کیا کر سکے گی۔

ابا نے واپس آکر کہا "شاہدہ کا فون ہے جاؤ بات کر لو۔"

میں نے بستر سے اتر کر چپلیں پہنیں۔ پھر کمرے سے نکل کر نرس کے چیمبر میں آیا۔ ہیڈ نرس نے ایک طرف رکھے ہوئے ریسیور کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے کہا "ہیلو، میں سلمان بول رہا ہوں۔" ہیڈ نرس وہاں سے چلی گئی۔

دوسری طرف سے آواز آئی۔ "میں ہوں شاہدہ۔"

"ہاں بولو، آرہی ہو یا کوئی رکاوٹ ہے؟"

وہ ذرا چپ رہی پھر بولی۔ "آسکتی ہوں۔ بے حیائی کو آتے جاتے کون روک سکتا ہے۔ لڑکی گھر سے بھاگنا چاہے تو ہزار حیلوں بہانوں سے بزرگوں کو چکر دے سکتی ہے۔"

"کیا تم نے کوئی تدبیر سوچی ہے؟"

"میرے پاس خواب آور گولیاں ہیں۔ اپنے والدین اور تمہارے والدین کو دودھ یا چائے میں دو دو گولیاں دے کر صبح تک سلا سکتی ہوں۔"

"میں مانتا ہوں اس قسم کی چالبازیوں میں تمہارا جواب نہیں ہے۔"

"میں نے یہ چالبازی یا شیطانی حرکت ان راتوں میں نہیں کی جب ہمارے کمرے ایک دوسرے کے بالکل قریب تھے۔ میں نے راتیں کالی کرنے کے لئے اپنے والدین کو نیند کی گولیاں نہیں کھلائیں۔"

"تم بات لمبی کر رہی ہو، آخر کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"یہی کہ تمہیں دل و جان سے چاہتی ہوں۔ خود کو تمہاری امانت سمجھتی ہوں اور شادی سے پہلے امانت میں خیانت نہیں کرنا چاہتی۔"

"کیا یہی بکواس کرنے کے لئے فون کیا ہے۔"

"یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ تم کزن ہو یا گناہ گار؟"

"میں گناہگار ہوں اور یہ گناہ تمہارے ساتھ ہوا ہے۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟"

"میں یہ بکواس خاندان کے بزرگوں تک پہنچاؤں گا اور صاف کہہ دوں گا کہ ایسی لڑکی شریک حیات بننے کے قابل نہیں رہتی جو پہلے ہی کزن کے ساتھ منہ کالا کر لیتی ہو۔"

کزن! کزن! تم اتنا بڑا جھوٹ بولو گے؟ اتنی شرمناک تہمت لگاؤ گے؟ فون پر اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ شاید وہ کیچڑ اچھالنے پر طیش میں آگئی تھی یا صدمے سے ٹوٹ رہی تھی۔ میں نے کہا "تمہاری نیک نامی کے لئے صرف آج کی رات رہ گئی ہے۔ گناہگار کے پاس آکر ہمیشہ کے لئے نیک ہو جاؤ یا گناہ سے دامن بچا کر عمر بھر کی بدنامی مول لو۔"

یہ کہتے ہی میں نے ریسیور رکھ دیا۔ اپنے کمرے میں واپس آگیا۔ ابا نے مسکرا کر کہا۔

"شاہدہ تمہارے لئے بڑی پریشان رہتی ہے۔ خیریت پوچھ رہی ہوگی۔"

"خیریت پوچھنے کا تو بہانہ ہے۔ مجھے پریشان کرتی رہتی ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو بیٹے؟"

"وہ آپ کے بھائی کی بیٹی ہے۔ آپ کو برا تو لگے گا لیکن سچ تو سچ ہے۔ اسے بڑوں کا لحاظ اور شرم نہیں ہے۔ ابھی فون پر ضد کر رہی تھی کہ رات کو اسپتال میں رہے گی۔ میں نے پوچھا تمہیں اپنی اور خاندان کی عزت کا خیال ہے یا نہیں۔ ہمارے بزرگ بے غیرت نہیں ہیں کہ جوان لڑکی کو اسپتال میں جوان لڑکے کے پاس چھوڑ دیں۔"

ابا نے شدید حیرانی سے پوچھا "کیا شاہدہ یہاں رات کو آنا چاہتی ہے؟ بیٹے، مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔"

"یقین نہ کریں۔ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔"

"نہیں، میں تمہیں جھوٹا نہیں کہتا مگر......"

"مگر وہ بچی، نیک اور پارسا ہے۔ ابھی آپ یہاں سے گھر جاتے تو وہ میری خیریت معلوم کر لیتی۔ گھڑی دیکھیں، ساڑھے چھ ہو چکے ہیں۔ رات کی تاریکی پھیل رہی ہے۔ ایسے میں وہ گھر سے نکل کر کس پبلک کال آفس میں فون کرنے آئی تھی؟ کیوں اس نے فون کیا؟ اسی لئے کہ مجھ سے یہاں آنے کی ضد کرے۔"

وہ سوچ میں پڑ گئے پھر بولے "کوئی بات نہیں بیٹے۔ ابھی بچی ہے۔ نادان ہے۔ یہ بات اپنی ماں سے نہ کہنا۔ وہ تو میرے خاندان والوں سے خار کھاتی ہے۔ اپنی بہن کی بیٹی سے تمہارا رشتہ کرنا چاہتی ہیں۔"

"ابا! اول تو میں اتنی جلدی ...... شادی کے خلاف ہے۔ پھر میں نے قریب رہ کر شاہدہ کے وہ رنگ ڈھنگ دیکھے ہیں کہ بس۔ آگے یہ کہاوت کافی ہے۔ کہ آنکھوں دیکھی مکھی نگلی نہیں جاتی۔"

ابا ایک جھٹکے سے یوں اٹھ کھڑے ہوئے جیسے منہ پر جوتا پڑا ہو۔ وہ شاہدہ کو بیٹی سمجھتے تھے۔ وہ سگے بھائی کی بیٹی تھی، اسے دل و جان سے چاہتے تھے۔ اس پر اتنا شرمناک الزام آیا تو وہ تڑپ گئے۔ بے چینی سے میرے بیڈ کے پاس ٹہلنے لگے۔ پھر میرے سامنے رک کر بولے۔ "شاہدہ کی بدنامی، میری تمہاری اور پورے خاندان کی بدنامی ہے۔ اس سلسلے میں میری دو باتیں یاد رکھو۔ ایک تو یہ کہ یہ الزام جھوٹا نہ ہو۔ دوسری یہ کہ الزام جھوٹا ہو یا سچا۔ یہ بات اسپتال کے اس کمرے سے باہر نہ جائے۔ اب بتاؤ کیا تم نے اپنی آنکھوں سے ہماری بچی میں کوئی خرابی دیکھی ہے۔ اگر نہیں دیکھی تو کوئی ثبوت یا گواہ ہے۔ اگر ہے تو ابھی پیش کرو۔"

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ابا شاہدہ کو اس قدر غیرت کا مسئلہ بنالیں گے۔ جب وہ گناہگار نہیں تھی تو میں اس کے خلاف ثبوت اور گواہ کہاں سے لاتا؟ انہوں نے پوچھا "تم نے مجرموں کی طرح سر کیوں جھکا لیا ہے؟"

میں نے جھجکتے ہوئے کہا "آپ کے سامنے جھکا ہوا سر مجرم کا نہیں گناہگار کا ہے۔"

میں بدستور سر جھکائے بیٹھا تھا اور اپنی خاموشی کو اقرار بنا رہا تھا۔ تہذیب اور شرم کے پردے میں رہ کر سمجھ رہا تھا کہ گناہگار ہی اپنے اور اس کے گناہ کا چشم دیدہ گواہ ہوتا ہے۔

پھر میں نے دیکھا کہ وہ تڑپ کر میری طرف آئے اور ایک زور دار طمانچہ میرے منہ پر رسید کر دیا۔ "ذلیل! کمبخت! تم عبادت کرتے ہو۔ خدا کا کلام پڑھتے ہو۔ پورے خاندان میں فرشتہ کہلاتے ہو اور تم نے ایسی حرکت کی۔ تم میرے بھائی کے گھر میں کھاتے رہے اور میرے بھائی کے گھر میں تھوکتے بھی رہے۔ ایک کتا بھی مالک کے گھر میں پیشاب نہیں کرتا۔ تم نے میرا سر شرم سے جھکا دیا ہے۔"

وہ زور زور سے سانسیں لے رہے تھے جیسے اپنے اندر بیٹے کی محبت سے کشتی لڑ رہے ہوں۔ اگر میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو اسے گولی مار دیتے۔ وہ کبھی غصے سے ٹہل رہے تھے۔ کبھی بیٹھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ میں اس لیے خون کے گھونٹ پی رہا ہوں کہ گھر کا معاملہ ہے۔ بیٹے اور بھتیجی کی غلطی ہے۔ اسپتال سے چھٹی ہوتے ہی تم دونوں کا نکاح پڑھا کر اس غلطی پر پردہ ڈال دیا جائے گا۔"

میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ بازی میرے خلاف ہو گئی تھی۔ میں اپنے اوپر حاوی رہنے والی لڑکی کو شریک حیات نہیں بنانا چاہتا تھا۔ میں نے سر جھکا کر کہا "ابا! میں شادی نہیں کروں گا۔ امی بھی اسے بہو نہیں بنائیں گی۔"

انہوں نے آنکھیں نکال کر تنبیہہ کے انداز میں انگلی دکھاتے ہوئے کہا "خبردار! اپنی امی سے ایسی کوئی بات نہ کرنا جس سے شاہدہ پر داغ لگتا ہو۔ تمہاری ماں یہ بدنامی اپنے میکے والوں میں پھیلا دے گی۔"

"ابا! یہ شادی میری بربادی ہوگی۔"

"بربادی ہونے دو۔ میرا فیصلہ نہیں بدلے گا۔"

میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ ایک تو یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شاہدہ کا پلڑا کیسے بھاری ہو جاتا تھا۔ میں جدھر سے اس پر حملے کرتا تھا ادھر سے مات کھاتا تھا۔ وہ سنجیدہ، باوقار اور شرم والی تھی۔ میں اس کی شخصیت کو مسخ کرنے میں ناکام رہتا تھا اور یہی باتیں خطرے کی گھنٹی بجاتی تھیں کہ شادی کے بعد وہ ہر پہلو سے مجھ پر حاوی رہے گی۔

انہوں نے کہا۔ "میں کل صبح ڈاکٹر سے کہوں گا کہ تمہیں چھٹی دے دے۔ میں جب تک تمہاری شادی نہیں کراؤں گا مجھے سکون نہیں ملے گا۔ میں راتوں کو سو نہیں سکوں گا۔"

"اب ایسی بھی کیا جلدی ہے ابا؟ میری تعلیم تو مکمل ہونے دیں۔"

"مجھے تعلیم سے زیادہ تمہاری سلامتی کی فکر ہے۔ میں نہیں چاہتا تمہارے ساتھ بھی وہی ہو جو تمہارے دادا کی ساتھ ہوا تھا۔ ان کی موت پاگل خانے میں ہوئی تھی۔ تمہاری دادی کی وفات کے بعد وہ ایک عورت کے دیوانے ہو گئے تھے۔ انہوں نے اس پر دولت لٹائی تاکہ وہ شادی کر لے لیکن اس نے دور ہی دور سے انہیں دیوانہ بنا کر پاگل خانے پہنچا دیا تھا۔"

یہ تو میں جانتا تھا کہ دادا پاگل ہو گئے تھے لیکن یہ اب پتا چلا کہ انہیں ایک عورت نے پاگل بنا دیا تھا۔ اگر مجھے پہلے ان کے پاگل پن کی وجہ بتائی جاتی تو میں اسے دادا جان کی حماقت کہتا۔ بھلا عورت بھی کوئی چیز ہے جس کے لئے پاگل ہوا جائے۔ لیکن اب ذاتی تجربات سے تسلیم کر رہا تھا کہ عورت کس طرح رفتہ رفتہ ہمارے اندر سرنگ بناتی ہے اور ہماری پہلی اور آخری ضرورت بن کر حواس پر چھا جاتی ہے۔ وہ ملے تو ہم ہوش مند، نہ ملے تو دیوانے ہو جاتے ہیں۔

میں اوپر سے کزن کے خلاف لڑ رہا تھا۔ اس پر کیچڑ اچھال رہا تھا۔ اسے شریک حیات نہیں داشتہ بنانا چاہتا تھا لیکن اندر سے اس کی ضرورت پکار رہی تھی۔ ابھی تو امی اور ابا کی موجودگی نے مجھے نارمل بنایا ہوا تھا۔ یہ نہ ہوتے اور تنہائی میں وہ ہوتی اور اس پر میری حکمرانی نہ چلتی تو میں پھر آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑتا اور اسپتال کے بجائے پاگل خانے پہنچا دیا جاتا۔

خاندانی پس منظر اور موجودہ حالات کے مطابق عقل یہی سمجھاتی تھی کہ شادی جلد ہو جائے اور میں دادا جان کی تاریخ نہ دہراؤں اور یہ طے کر لوں کہ شادی کے بعد کس طرح شاہدہ کو پاؤں کی جوتی بنا کر پہنے رہنا ہے۔ فوری طور پر یہی بات عقل میں آئی کہ اسے نظروں سے گرا کر اپنی زندگی میں لایا جائے۔ میں نے کہا "ابا! میں آپ کی ہر بات مان لوں گا۔ آپ میری ایک بات مان لیں۔"

"بات معقول ہوگی تو ضرور مانوں گا۔"

"آپ ہمارا رشتہ پکا کرنے سے پہلے مجھ کو اور شاہدہ کو لعن طعن کریں۔ میرے ساتھ اسے بھی احساس دلائیں کہ ہم نے بزرگوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔"

"شاباش بیٹے شاباش! تمہارے یہ احساسات اور خیالات سن کر دل خوش ہو گیا۔ میں شاہدہ کو اس سلسلے میں ضرور ڈانٹوں گا۔"

مجھے کسی قدر اطمینان ہوا۔ میں نے اسے چیلنج کیا تھا کہ اس کی پارسائی کے غرور کو خاک میں ملاؤں گا۔ وہ اپنی ذات میں لاکھ پارسا رہے لیکن اس کا دامن داغدار اور آنچل تار تار دکھائی دیتا رہے گا۔

پھر یہی ہوا۔ اس رات ابا نے گھر جا کر چاچا اور چاچی کو ہماری غلطی کے متعلق بتایا۔ میں وہاں تماشا دیکھنے کے لئے موجود تھا۔ لیکن قیاساً" کہہ سکتا تھا کہ چاچا کا سر شرم سے جھک گیا تھا۔ چاچی نے بیٹی کی پٹائی کی تھی۔ وہ قسمیں کھا کر کہہ رہی تھی کہ وہ اتنی ہی پاک ہے جتنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے بعد رہتی آئی ہے لیکن کوئی یقین نہیں کر رہا تھا۔ مجھ جیسا فرشتہ کہلانے والا خود کو اس کے ساتھ گناہگار ٹھہرا رہا تھا۔ ایسی صورت میں اس کا انکار اور اس کی قسمیں بے وزن ہو کر رہ گئی تھیں۔

دوسری صبح پانچ بجے وہ تنتناتی ہوئی اسپتال کے کمرے میں آ گئی۔ امی میری بیڈ کی پائنتی پر سکڑ کر سو رہی تھیں۔ اس کی آواز سن کر اٹھ بیٹھیں۔ شاہدہ مجھ سے کہہ رہی تھی۔ "چلو اٹھو یہاں سے اور مسجد میں چلو۔ میں تمہارا ایمان دیکھنا چاہتی ہوں کہ تم خدا کے گھر میں بھی سچ بول سکتے ہو یا نہیں؟"

میں ایک دم سے بوکھلا گیا۔ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ بزرگوں کا خوف اور لحاظ بھول کر یوں چڑھ دوڑے گی۔ امی نے گھور کر پوچھا "شاہدہ! بات کیا ہے؟ تو میرے بیٹے کو مسجد کیوں لے جائے گی؟"

"یہ آپ اپنے بیٹے سے پوچھیں۔"

"میں تجھ سے پوچھ رہی ہوں؟ اتنی صبح اکیلی آئی ہے۔ گھر سے منہ اندھیرے نکلی ہو گی۔ کیا میرے بیٹے کے ساتھ فجر کی نماز پڑھنے آئی ہے۔"

"آپ نے درست سمجھا ہے۔ یہ ابھی میرے ساتھ مسجد میں جائے گا۔"

"کیسی بدتمیزی سے بول رہی ہے۔ یہ تجھ سے عمر میں بڑا ہے۔"

وہ بولی "اپنی ماں کو بتاؤ' تم کرتوت میں شیطان سے بھی بڑے ہو۔"

میں نے کہا۔ "امی! آپ خاموش رہیں۔ یہ غصے میں ہے۔ خواہ مخواہ بات بڑھے گی۔"

"بیٹے! تم اس لڑکی کے غصے سے ڈر رہے ہو؟"

وہ بولی۔ "ڈرنے کی بات ہے۔ اس لئے بچہ ڈر رہا ہے۔"

وہ بیڈ سے اتر کر چپل پہنتے ہوئے بولیں۔ "آخر بات کیا ہے۔ یہ شیرنی بن کر گھر سے یوں غراتی کیوں آئی ہے اور اتنی سرچڑھ کر کیوں بول رہی ہے؟"

اسی وقت چاچی' چاچا اور ابا تیزی سے چلتے ہوئے آئے۔ انہوں نے شاہدہ کو دیکھا۔ پھر مجھے کاغذ کا ایک ٹکڑا دکھا کر کہا "شادہ یہ پرچی گھر میں لکھ کر آئی ہے کہ یہ ابھی تمہیں مسجد میں لے جانے کے لئے اسپتال جا رہی ہے۔"

چاچی نے بیٹی سے کہا "تجھے پرچی لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا یہاں آنے کے لئے مجھ سے نہیں کہہ سکتی تھی؟"

"آپ لوگوں سے کہتی تو یوں آنے کی اجازت نہ ملتی۔ ان صاحبزادے کو مجھ پر اور زیادہ کیچڑ اچھالنے اور اپنا بچاؤ کرنے کر موقع مل جاتا اور مجھے محاسبہ کرنے میں جتنی دیر ہوتی اتنی دیر تک میری ناکردہ بے حیائی پر میرے امی ابا کا کلیجہ چھلنی ہوتا رہتا۔"

میرے ابا نے کہا "بیٹی! اونچی آواز میں نہ بولو۔ اسپتال والے جمع ہو جائیں گے۔"

"ہونے دیں۔ جب میں بدنام ہو رہی ہوں تو سب ہی بدنام ہوں گے۔ آپ کو خاندان کی عزت اور غیرت کا اتنا ہی خیال ہے تو بیٹے کو ابھی مسجد میں لے چلیں۔"

ابا نے مجھ سے کہا۔ "اٹھو یہ جہاں کہتی ہے' وہاں چلو۔"

میں مشکل میں پڑ گیا۔ اسپتال یا گھر میں باتیں ہوتیں تو میں سو پینترے بدل کر اسے جھوٹی اور بدکار ثابت کر دیتا لیکن میں نے تو پہلے ہی اس کے متعلق رائے قائم کر لی تھی کہ یہ مرد کو شکنجوں میں کسنے والی لڑکی ہے۔ اب یہ مجھے اللہ کے گھر میں پکڑ کے لے جا رہی تھی۔

یہ درست ہے کہ بے ایمان عدالتوں میں کلام پاک اٹھا کر اور مسجد میں قسمیں کھا کر بھی جھوٹ بولتے اور دھوکا دیتے ہیں لیکن میری گھٹی میں اللہ کا خوف تھا۔ اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ میں مسجد جانے کے لئے بستر سے نہیں اٹھا۔ مجرم کی طرح سر جھکائے بیٹھا رہا۔ ابا نے کہا۔ "تم نے سنا نہیں؟ یہاں سے اٹھو اور چلو۔"

امی نے کہا۔ "یہ آپ لوگ میرے بیٹے کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں؟"

ابا نے کہا "صبر کرو۔ ابھی معلوم ہو جائے گا۔"

میں بیڈ سے اتر کر امی کے پیچھے آ گیا۔ ان کے پاس پناہ لے کر بولا "امی! میں آپ کے پاس رہوں گا۔ ان لوگوں کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔"

ابا نے کہا "اچھا ماں کی گود میں چھپ رہے ہو۔ اس کا مطلب ہے تم جھوٹ بول رہے تھے۔ معصوم شادہ پر شرمناک الزام لگا رہے تھے۔ یہ شیطنت تمہارے اندر کیوں پیدا ہوئی؟"

چاچا نے پوچھا۔ "میں نے تمہیں بیٹا بنا کر رکھنے میں کوئی کمی کی تھی؟"

چاچی نے کہا "بیٹے! مائیں دودھ پلا کر پالتی ہیں۔ میں تو دعائیں مانگ مانگ کر تمہیں پالتی رہی۔"

شاہدہ نے کہا "امی! آپ اسے بیٹا نہ کہیں۔ کیونکہ یہ میرا بھائی کہلانے کے لائق نہیں

ہے۔ مجھ پر تہمت لگانے والا میرا مجازی خدا بھی نہیں بن سکے گا۔ اگر یہ میرے گھر میں قدم رکھے گا تو میں گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔"

ابا نے کہا۔ "بیٹی! غصہ برداشت کرو۔ میں مانتا ہوں تمہاری انا کو مجروح کیا گیا ہے لیکن یہ ہمارے گھر کے اندر کا معاملہ ہے۔ جو بات بگڑ چکی ہے' اسے ہم بنائیں گے۔ میں اسے ایسی سزا دوں گا۔' ایسی سزا دوں گا کہ ...."

شاہدہ نے کہا۔ "نہیں' آپ میں سے کسی کی بھی دی ہوئی سزا اسے کم پڑے گی۔ سزا میں دے رہی ہوں۔"

ابا نے کہا "میری طرف سے تمہیں اجازت ہے۔"

چاچا نے کہا۔ "بیٹی بات ختم کرو۔"

"کیا میری بے گناہی ثابت نہ ہوتی تو بات ختم ہو جاتی؟ کیا مجھے دلہن بنا کر لے جانے سے بدکاری کا داغ مٹ جاتا۔ بیٹی باپ کے گھر سے ہزاروں لاکھوں کا جہیز لے کر جاتی ہے لیکن ماں کی تربیت بیٹی کی بے داغ آبرو جہیز میں دیتی ہے۔ اس جھوٹے الزام کے بعد میری ماں کے پاس بیٹی کو دینے کے لئے کچھ نہیں رہا تھا۔ یہ شخص مجھے بیوی بنانے کے بعد تمام رشتے داروں اور دوستوں میں اسی طرح ذلیل کرتا جیسے شادی سے پہلے کر رہا ہے۔ کل ہی اس نے فون پر مجھے ذلیل اور رسوا کرنے کا چیلنج کیا تھا۔"

سب نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ ابا نے پوچھا "تم نے ایسا چیلنج کیوں کیا تھا؟"

میں امی کے پیچھے ان سے لپٹا ہوا تھا۔ وہی میرا مضبوط سہارا تھیں۔ میں نے کہا۔ "امی! ڈاکٹر نے کہا ہے مجھے پریشان نہ کیا جائے۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے امی!"

وہ بولیں۔ "میرے بچے کو آرام کرنے دیں۔ کیا آپ اسے پاگل بنا دینا چاہتے ہیں۔"

ابا نے کہا۔ "میں شاہدہ سے آخری بار پوچھ رہا ہوں۔ کیا اس مکار فریبی لڑکے کو معاف کرے گی۔ اگر نہیں کرے گی تو آج سے میں اسے اپنا بیٹا تسلیم نہیں کروں گا۔"

"مجھے افسوس ہے تایا ابا! میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی لیکن ایک درخواست کروں گی۔ جانے سے پہلے آخری بار آپ کے بیٹے سے تنہائی میں دو باتیں کرنا چاہوں گی۔"

ابا نے چاچا کو دیکھا۔ چاچا نے کہا۔ "بھائی جان! آپ بڑے ہیں۔ ہمیں اپنی بیٹی پر اعتماد بھی ہے اور فخر بھی۔"

امی نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "یہ میرے بیٹے سے تنہائی میں کیا کہنا چاہتی ہے؟ میں اسے چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔"

ابا نے کہا۔ "سیدھی طرح باہر چلو اور دونوں کو تھوڑی دیر کے لئے تنہا چھوڑ دو۔"

میں نے کہا۔ "امی آپ جائیں۔ فکر نہ کریں۔"

امی دوسرے تمام بزرگوں کے ساتھ کمرے سے جانے لگیں۔ میں بستر پر آ کر بیٹھ گیا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دروازے کے پاس گئی۔ پھر اس کے دونوں پٹ بند کر کے فاتحانہ شان سے میری طرف گھوم گئی۔ ہماری نظریں ایک دوسرے سے ٹکرانے لگیں۔ کبھی وہ نظریں جھکا لیا کرتی تھی' اب جھکنا اور گرنا بھول گئی تھی۔ اس نے کہا "یہ پرانی کہاوت ہے کہ بد اچھا بدنام برا۔ اگر ہمارے درمیان بدی ہوتی تو شاید میں اسے برداشت کر لیتی لیکن تم نے بدنام کر کے بڑی کمینگی کا ثبوت دیا ہے۔ اسے میں برداشت نہیں کروں گی۔ تم نے ناجائز طریقوں سے مجھے حاصل کرنے کی ناکام کوشش کی۔ اب جائز طریقے سے بھی حاصل نہیں کر سکو گے۔" وہ ٹہلنے کے انداز میں چلتی ہوئی میرے بیڈ کے ایک طرف سے دوسری طرف آئی پھر بولی۔ "میں پھر اکیلی تمہارے کمرے میں ہوں۔ مرد کے بچے ہو تو میرا ہاتھ پکڑو۔"

اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں نے گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ بولی۔ "تم گھبرا رہے ہو اس لئے کہ بزرگوں کا اعتماد تم پر سے اٹھ گیا ہے اور میں بھرپور اعتماد حاصل کر کے آئی ہوں۔"

وہ درست کہہ رہی تھی۔ اگر میں ہاتھ پکڑتا اور وہ چیخ مارتی تو بزرگ کبھی یقین نہ کرتے کہ اس نے ہاتھ پیش کیا تھا۔ مجھے پھر ایک بار شیطان تسلیم کیا جاتا۔ وہ بولی۔ "کیا دیکھ رہے ہو۔ یہ وہی گورے گورے چکنے ہاتھ ہیں۔ یہی گورا بدن تمہارے سامنے بارش میں بھیگتا رہا تھا اور تم مسرتوں کی برسات میں بھیگتے رہے تھے۔ کیسی کم نصیبی ہے کہ صرف خیالی مسرتیں ملتی ہیں۔ وہ خواب خواب مسرتیں تعبیر بن کر تمہاری تنہائی میں آتی ہیں اور تم اس جیتی جاگتی تعبیر کو پکڑ نہیں سکتے۔ اور جب نہیں پکڑ سکتے تو دیوانے ہو جاتے ہو' چیختے چلاتے ہو اور دیواروں سے ٹکریں مارتے ہو۔ آج آخری بار یہ بدن تمہارے پاس آیا ہے۔ آج کے بعد تمہاری زندگی میں بہت سی شاہدائیں آئیں گی لیکن بدن کا یہ تاج محل تمہیں کبھی نصیب نہیں ہو گا جسے تم نے میرے گھر کا نمک کھا کھا کر دن رات دیکھا ہے۔ میری ماں کی گود میں سر رکھ کر مجھے ڈھونڈا ہے۔ میں تب بھی نہیں ملی' اب بھی نہیں مل رہی ہوں۔ میں جا رہی ہوں۔ آج کے بعد میرے دل سے جتنی بددعائیں نکلیں گیں وہ سب تمہارے لئے ہوں گی۔"

یہ کہتے ہوئے وہ پلٹ گئی۔ تیزی سے چلتی ہوئی دروازے کے پاس گئی پھر اسے ایک جھٹکے سے کھول کر باہر نکل گئی۔ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میرے جی میں آیا زور زور سے چیخ پڑوں۔ اسے چیخ چیخ کر گالیاں دوں' دوڑ کر جاؤں اور واپس کھینچتے ہوئے کمرے میں لا کر اس کا لباس تار تار کر دوں۔ اس کی پارسائی کی دھجیاں اڑا دوں۔ میرے اندر ایسا کر گزرنے کی تحریک پیدا ہو رہی تھی۔ میں زور زور سے ہانپ رہا تھا۔ جیسے درندہ اپنے شکار تک نہ پہنچنے کے باعث بے چین ہو جاتا ہے۔ ویسے ہی میں بستر پر ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل رینگ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے ایک مسکن دوا دی تھی اور تاکید کی تھی کہ جب ذہنی انتشار

بڑھے اور یہ محسوس کرو کہ دماغی طور پر بے قابو ہونے والے ہو تو وہ دوا کھا لینا۔ میں نے سرہانے کی میز سے وہ دوا اٹھائی۔ گلاس میں پانی لیا پھر دو گولیاں نگل لیں۔

فوراً ہی سکون نہیں ملا مگر اعتماد پیدا ہوا کہ نارمل رہوں گا۔ وہ مجھے پاگل بنانا چاہتی ہے لیکن میں اس کے اشتعال دلانے سے مشتعل ہونے کی غلطی نہیں کروں گا۔ تھوڑی دیر بعد میں سیدھا لیٹ گیا۔ پھر مجھے نیند آگئی۔

چونکہ میرے اندر ہیجان دبا ہوا تھا۔ غبار نکلا نہیں تھا۔ اس لئے گہری نیند نہیں آئی۔ میں نیم خوابیدہ سا تھا ۔ کزن کو دیکھ رہا تھا۔ پتا نہیں وہ سپنا تھا' میری سوچ تھی یا میرے بھوکے ارادے تھے جو بند آنکھوں کے پیچھے پورے ہو رہے تھے۔ سبز باغ اسے کہتے ہیں جو تصور میں دکھایا جاتا ہے۔ حقیقتاً اس کا وجود نہیں ہوتا۔ وہ اپنے بدن کا سبز باغ دکھا گئی تھی۔ میں اسے چھونا چاہتا تھا' وہ ٹرانسپرنٹ ہو جاتی تھی یعنی شیشے کی طرح آر پار دکھائی دیتا تھا۔ وہ ہوا تھی' مٹھی میں نہیں آتی تھی۔ وہ خوشبو تھی مگر سونگھنے سے پہلے ہی اڑ جاتی تھی۔ وہ سب رنگ تتلی تھی' اپنے پیچھے دوڑاتی تھی۔ اسی دوڑ بھاگ کے دوران کانٹا چبھا تو میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

میری امی مجھے جھنجوڑ کر پوچھ رہی تھی۔ "کیا ہوا بیٹا؟ آنکھیں کھولو۔"

امی اور اسپتال کو دیکھ کر اطمینان ہوا کانٹا پاؤں میں نہیں چبھا تھا۔ ہاں چبھا نہیں چبھی ہوئی تھی۔

امی نے پوچھا۔ "تم ٹھیک ہونا؟ ڈاکٹر کو بلاؤں؟"

"نہیں' میں ٹھیک ہوں۔ ابا وغیرہ کہاں ہیں؟"

"وہ چلے گئے۔ تمہارے باپ کے سینے میں دل نہیں پتھر ہے۔ وہ ایسی حالت میں تجھے چھوڑ کر بھتیجی کے ساتھ گئے ہیں۔ مجھے حکم دیا ہے کہ ہسپتال سے چھٹی کرا کے تمہیں حویلی لے جاؤں۔"

"امی! میں یہ شہر چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ تعلیم ادھوری نہیں چھوڑوں گا۔"

"چولہے میں گئی تمہاری تعلیم۔ ابھی نیند میں کزن' کزن پکار رہے تھے۔ یہی ہے تمہاری تعلیم؟"

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "میں کس کزن کو پکار رہا تھا۔"

"کسی کزن کو نہیں' اسی کو پکار رہا تھا۔ میں اتنی بھی جاہل نہیں ہوں کہ کچھ سمجھ ہی نہ سکوں۔ میں ابھی ڈاکٹر صاحب کے پاس جا رہی ہوں۔ ہم آج ہی شام کی کوچ سے پنڈ چلیں گے۔"

"میں نے کہہ دیا' میں نہیں جاؤں گا۔"

"نہیں جائے گا تو کہاں رہے گا؟ چاچا کے گھر میں تیرا داخلہ بند ہو چکا ہے۔"

"میں لعنت بھیجتا ہوں چاچا کے گھر پر۔"

"شاباش بیٹا! میں اپنی بھانجی سے تیری شادی کراؤں گی۔"

"میں پنڈ نہیں جانا چاہتا اور آپ شادی کی بات کر رہی ہیں"

"میرے ساتھ نہیں جائے گا تو یہاں ٹھکانا کہاں ہے؟"

"ہاسٹل میں رہوں گا۔"

"ہوٹل میں کتنے دن رہے گا؟"

"امی! ہوٹل نہیں ہاسٹل۔"

"یہ ہاسٹل کیا ہوتا ہے؟"

"طلباء کی رہائش گاہ ہوتی ہے۔ دوسرے علاقوں سے پڑھنے کے لئے آنے والے لڑکے وہاں رہتے ہیں۔ میں وہاں بڑے آرام سے رہوں گا۔ آپ صرف ابا کو راضی کر لیں۔"

امی نے اپنے طور پر بڑی کوششیں کیں کہ میں کسی طرح پنڈ واپس جانے کے لئے راضی ہو جاؤں لیکن میں نے یہاں رہنے کی ضد پوری کر لی۔ ابا نے کہہ دیا۔ "میری طرف سے تم جہنم میں رہو۔ اچھی تعلیم حاصل کر کے آؤ گے تو حویلی میں گھسنے دوں گا۔ چاچا' چاچی اور شاہدہ کے دل کسی طرح جیت کر آؤ گے تو سر آنکھوں پر بٹھاؤں گا۔ آئندہ رقم کی ضرورت ہو تو اپنی ماں کو خط لکھنا۔ میں تمہارے خط کا بھی جواب نہیں دوں گا۔"

امی چاچا کے ہاں سے میری کتابیں اور سامان لے آئیں۔ میں نے فی الحال ایک سستے ہوٹل میں کمرا لیا اور ہوسٹل میں رہائش کے لئے پرنسپل کو درخواست لکھ کر دی۔ اسلم کو پتا چلا تو اس نے کہا "سفارش کے بغیر ہاسٹل کا کمرا نہیں ملے گا۔ قاسم کا باپ ایم این اے ہے۔ تمہاری درخواست پر اس کے باپ کے دستخط ہوں گے تو ہاسٹل کے دروازے تمہارے لئے کھل جائیں گے۔"

میں پھر ایک بار قاسم کی کوٹھی میں آیا۔ اپنا مدعا بیان کیا تو اس نے کہا۔ "یار! کیا غیروں جیسی باتیں کرتے ہو۔ یہ شاہی قلعے جیسی پھیلی ہوئی کوٹھی کس لئے ہے۔ جو کمرا چاہو' پسند کر لو۔ جتنے برس چاہو' رہ لو۔ کوئی تمہیں یہاں سے جانے کو نہیں کہے گا۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو تمہاری محبت ہے لیکن میرے والد اس معاملے میں بڑے سخت ہیں۔ وہ دو چار دوستوں کی ٹولی بنا کر رہنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ میرے لئے ہاسٹل میں بندوبست کرا دو۔"

"بندوبست ہو جائے گا لیکن چند ہفتے یا چند مہینے لگ سکتے ہیں۔ بائی دی وے' چاچا کا گھر کیوں چھوڑ رہے ہو؟"

"کچھ خاندانی جھگڑے پیدا ہو گئے تھے اس لئے وہ گھر چھوڑ دیا۔ آج کل ہوٹل میں ہوں۔"

"ہوٹل؟" ان چاروں دوستوں نے چونک کر دیکھا۔ پھر قاسم اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا "لعنت ہے ہم پر۔ تم ہوٹل میں رہتے ہو اور ہمیں آج معلوم ہو رہا ہے۔ چلو اٹھو ہمارے

ساتھ ہوٹل چلو اور ابھی اپنا سامان یہاں لاؤ۔"

میں نے کچھ کہنا چاہا۔ محمود نے کہا "خبردار! انکار نہ کرنا۔ ہم نے تمہاری بات مان لی کہ تمہیں ہاسٹل میں رہنا چاہئے۔ تم بھی مان لو کہ جب تک ادھر بندوبست نہ ہو' یہاں ہمارے ساتھ رہو گے۔"

ریاض نے کہا "ایک بات یاد رکھو۔ قاسم کی بات مانو گے تو ہاسٹل والا کام جلدی ہو جائے گا۔"

میں انہیں ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنا کام نکالنے کے لئے ان کے ساتھ عارضی رہائش کے لئے آمادہ ہو گیا۔ ان کے ساتھ ہوٹل جا کر اپنا سامان لے آیا۔ انہوں نے میرے لئے ایک کمرا مخصوص کر دیا لیکن وہاں پڑھنے کے لئے ایک کتاب بھی نہ کھول سکا۔ ایک تو وہاں چاروں دوستوں کی چنڈال چوکڑی تھی۔ ریڈیو' کیسٹ ریکارڈر' ٹی وی اور وی سی آر جیسی دلچسپیوں کے سامان تھے۔ وہ کسی بھارتی فلم کا جذباتی ناچ گانا دکھانے کے لئے مجھے کمرے سے بلاتے تو میں دیکھتے دیکھتے وہیں بیٹھا رہ جاتا تھا۔ اسکرین پر نظر آنے والے مناظر میں ڈوب کر کہیں سے کہیں پہنچ جاتا تھا۔

ابتدا میں احساس نہیں ہوا کہ پھر میرے اندر آتشی لاوا پک رہا ہے۔ ایک شام ریاض نے کہا "یار! تم راتوں کو بہت شور مچاتے ہو۔ یہ کزن کون ہے؟"

میں نے اسے حیرت سے دیکھا۔ محمود نے پوچھا۔ "کیا یہ وہی تو نہیں جس کا نام ہم نہیں جانتے تھے اور نادانستگی میں اسے شاہدہ کہا تھا؟"

اس کا نام سن کر دل پر گھونسا سا لگا۔ میں نے پوچھا "کیا میں نیند میں کسی کا نام لیتا ہوں؟"

"نام تو نہیں لیتے ہو۔ البتہ کزن کہتے ہو۔"

اسلم نے کہا۔ "اور ایسی ایسی باتیں کرتے ہو جنہیں سن کر ہم بالغ ہو جاتے ہیں۔"

یہ قہقہے لگانے لگے۔ میں جھینپ رہا تھا۔ قاسم نے میرے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "یار! شرماتے کیوں ہو۔ شرماتی تو لڑکیاں ہیں۔ بھئی محمود! ہمارے پاس وہ ویڈیو کیسٹ ہیں نا جس میں ایک جوان بڑا شرمیلا ہوتا ہے۔ اس کی زندگی میں ایک حسینہ آتی ہے۔ اس کہانی میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ جب تک کسی حسینہ کے متعلق سوچتے رہو' شرم اور جھجک سی رہتی ہے۔ حسینہ مل جائے تو رفتہ رفتہ جھجک دور ہو جاتی ہے۔"

محمود نے کہا "وہ کیسٹ ویڈیو کی دکان سے لایا گیا تھا۔ دس روپے کرایہ دو پھر ادھر جاؤں گا تو روٹی شوٹی لے آؤں گا۔"

قاسم نے کہا "چرغہ کھانے کو جی چاہتا ہے مگر میرے ڈیڈی نے ابھی تک خرچ کے روپے نہیں بھیجے ہیں۔"

میں نے پانچ سو کا نوٹ نکال کر دیا۔ ریاض نے کہا "تم سے لینا اچھا نہیں لگتا۔"

"کیوں اچھا نہیں لگتا؟"

"اس لئے کہ مہمان ہو۔ ہمارے بے تکلف دوست نہیں بنتے ہو۔"

محمود نے پانچ سو کا نوٹ میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔ "پکی دوستی کرو گے تو ہم یہ روپے لیں گے۔"

"بھئی میں دوست ہوں اور پکی دوستی کیسی ہوتی ہے؟"

"ہم ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں چھپاتے ہیں- سب اپنی اپنی معشوق کی باتیں کرتے ہیں لیکن تم کزن والی بات چھپتے ہو-"

قاسم نے کہا- "او بھئی! اپنا یار کھلتے کھلتے کھلے گا- تم جاؤ کیسٹ اور چرغے لے آؤ-"

جب اپنے اندر رنگین اور سنگین جذبات کروٹیں لیتے ہیں تو جی چاہتا ہے کہ ہم کسی کو راز دار بنا کر اس سلسلے میں خوب بولیں- یوں اندر سے تھوڑا دھواں نکل جاتا ہے- ان چاروں نے ایک ایک محبوبہ پال رکھی تھی اور بڑے چٹخارے لے کر ایک دوسرے کے سامنے اپنی اپنی محبت کا جغرافیہ پیش کرتے رہتے تھے- ایک وقت تھا جب میں ایسی باتوں سے توبہ توبہ کرتا تھا- اب ان کے درمیان بیٹھ کر شوق سے سنتا تھا- انہوں نے مجھے بھی اپنے دل کی باتیں سنانے پر مجبور کیا تو میں نے وہ تمام حالات بتا دیئے جن سے گزرتے ہوئے اسپتال پہنچ گیا تھا- ہم عزت دار لوگ ہیں اپنے ڈیڈی کی سیاسی پوزیشن کا خیال رکھنا پڑتا ہے- ورنہ کزن کو اغوا کر کے تمہارے پاس یہاں لے آتے- یار! حد ہو گئی' اس نے تمہیں پاگل بنا دیا-"

اسلم نے کہا "لڑکیاں تو پاگل بناتی ہی ہیں-"

"ابے پاگل نہیں دیوانہ بناتی ہیں- دیوانہ بنانے اور پاگل بنانے میں فرق ہے-"

ریاض نے کہا- "بھئی یہ کیا فلسفہ لے بیٹھے ہو- اپنے یار کے لئے کچھ کرو-"

محمود نے میری پشت پر ہاتھ مار کر کہا- "یہ اپنا سلمان کچھ منہ سے کھلتا نہیں ہے- اس کے لئے روبی کیسی رہے گی؟"

میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا- پوچھنا چاہتا تھا- یہ روبی کون ہے؟ قاسم نے کہا "او نہیں یار! تم نے سلمان کی اسٹوری توجہ سے نہیں سنی- اس کی کزن صحت مند ہے- شہر میں رہتی ہے لیکن پنڈ کی کڑی لگتی ہے- روبی تو اس کے سامنے مچھر ہے- دوست کی مدد کرنا ہو تو تگڑی مدد کرو-"

"پروین ٹھیک رہے گی-"

"وہ موٹی ہے- ایک تو یہ سمجھ نہیں آتی کہ تم لوگ موٹاپے کو صحت مندی کیوں سمجھتے ہو- وہ بھئی وہاں سے میرا البم اٹھاؤ- اس میں نیلم کی تصویر ہے-"

میں نے پوچھا- "قاسم بھائی! یہ روبی' پروین اور نیلم کون ہیں؟"

"یہ کرائے کی ویڈیو کیسٹیں ہیں زندہ کیسٹس-"

میں نے انکار میں ہاتھ ہلا کر کہا- "نہیں قاسم بھائی! میں نے کبھی ایسا سوچا بھی نہیں-"

"پھر کیا سوچا ہے؟"

"مجھ سے کبھی گناہ نہیں ہوگا-"

"تو پھر تم نے کزن سے کس بات کا جھگڑا کیا تھا؟"

"اس کی بات نہ کرو- اس کا معاملہ کچھ اور ہے- پتا نہیں کیوں وہ مجھے اپنی گھر والی لگتی رہی- لیکن وہ میرے لئے چیلنج بن گئی تھی-"

"تم بھی عجیب ہو- یہ جو ویڈیو پر حسین عورتوں کو دیکھتے ہو تو یہ اچھی لگتی ہیں؟ کیا یہ گناہ نہیں ہے؟"

"ہاں- صرف آنکھوں کا گناہ ہے- دیکھتا ہوں پھر دیکھ کر بات ختم ہو جاتی ہے-"

"بات کہاں ختم ہوتی ہے بھئی' وہ تو دماغ میں پکتی رہتی ہے خوابوں میں بھڑکتی رہتی ہے- اس لئے تم نیند میں اسے پکارتے ہو- اگر پھر شدت بڑھے گی تو پھر ذہنی توازن کھو بیٹھو گے- اس کا علاج یہی ہے جو ہم بتا رہے ہیں-"

میں نے ایسے علاج سے انکار کر دیا- یہ درست ہے کہ میں فلموں میں پرائی عورتوں کو دیکھتا تھا لیکن کالج میں لڑکیوں سے بات کرتے ہوئے ہچکچاتا تھا- انہیں نظر بھر کر نہیں دیکھتا تھا- شاید اس لئے کہ دیکھنے کے لئے شاہدہ بہت تھی- اب وہ نہیں رہی تھی لیکن اپنا آسیب چھوڑ گئی تھی- ایک رات چنڈال چوکڑی نے ایک بہت ہی رومانی اور جذباتی فلم دکھائی- جب وہ ختم ہوئی تو میرے دماغ میں ہلکی سی دھند چھا گئی تھی- میں کچھ ہوش میں تھا اور کچھ مدہوش سا تھا آس پاس بیٹھے ہوئے ساتھیوں کی موجودگی کا علم تھا لیکن وہ نظر نہیں آ رہے تھے- ان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں- قاسم نے پوچھا "فلم کیسی لگی؟"

میں نے سحر زدہ ہو کر کہا "ایک بار دیکھا ہے- دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے-"

اس کیسٹ کو ریوائنڈ کر کے دوسری بار چلایا گیا ہے- قاسم نے میرے ہاتھ میں ریموٹ کنٹرولر دے کر کہا "تمہیں جو سین پسند نہ آئے اسے آگے بڑھا دو' جو پسند آئے اسے بار بار ریوائنڈ کر کے دیکھو-"

ان لمحات میں ایک حسرت تھی- کاش کوئی ایسا ریموٹ کنٹرولر ہوتا جس کے ذریعے میں شاہدہ کو بار بار ریوائنڈ کر کے دیکھ سکتا- میں نے بعض مناظر کو کئی بار اس لئے دیکھا کہ ہیروئن کی جگہ شاہدہ نظر نہیں آ رہی تھی جبکہ ہر لڑکی میں اس کا روپ دکھائی دیا کرتا تھا- اب میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا تھا- ریوائنڈ کرتا تھا شاید اب کی بار دکھائی دے- لیکن وہ ایسی گم ہو گئی تھی جیسے میری آنکھوں کو اپنے دیدار سے اندھا کر دیا ہو اور اس اندھے پن کو مقدر بنا دیا ہو کہ میں آئندہ کبھی اسے دیکھ نہیں سکوں گا-

دیکھتے دیکھتے ریوائنڈ کرتے کرتے میں یکبارگی پھٹ پڑا- چیخ کر بولا' کہاں مر گئی ذلیل کمینی! دکھائی کیوں نہیں دیتی؟"

وہ چاروں ایکدم سے اچھل پڑے- رات کے دو بج گئے تھے- ان میں سے کوئی سو رہا تھا- کوئی اونگھ رہا تھا' وہ ایسی فلمیں دیکھتے ہی رہتے تھے اس لئے نصف بیدار تھے نصف خوابیدہ تھے- میرے چیخنے پر وہ گھبرا کر میری طرف لپکے "کیا ہوا؟ کس سے بول رہے ہو؟"

"وہ ...... وہ ......" میں نے ٹی وی اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ چاروں میرے آس پاس تھے۔ ایک نے میرے سر پر آئس بیگ رکھا تھا۔ دماغ کو ٹھنڈک پہنچ رہی تھی۔ وہ مجھے میرے بستر پر لے آئے تھے۔ میں نے کہا۔ "یہ ساتھ والی دراز میں سکون کی دوائیں ہیں۔"

انہوں نے مجھے دوائیں کھلائیں۔ میں تھوڑی دیر بعد سو گیا لیکن ان کی نیند اڑ گئیں۔ میں سوتا رہا۔ وہ جاگتے رہے اور مجھے مصیبت سمجھ کر آپس میں مشورے کرتے رہے۔ میں ابتداء میں ان سے دور بھاگتا تھا اب انہیں دوست اور ہمدرد سمجھنے لگا تھا۔ یہ مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہ مجھے کس طرح مزید پاگل بنا دینے کی پلاننگ کر رہے تھے۔

وہ چاروں دولت مند گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ مجھے نقصان پہنچا کر کوئی بہت بڑا فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ چونکہ بگڑے ہوئے رئیس زادے تھے۔ اس لئے قرضوں میں جکڑے رہتے تھے۔ ان دنوں انہیں بیس ہزار روپے کی سخت ضرورت تھی۔ یہ رقم وہ جوئے میں ہار گئے تھے اور ادائیگی کے لئے ایک ہفتے کی مہلت حاصل کی تھی۔ مہلت بھی اس لئے انہیں مل گئی تھی کہ قاسم نے اپنی دو لاکھ کی کار گروی رکھی تھی۔ اگر وہ سات دنوں کے اندر بیس ہزار روپے ادا نہ کرتے تو وہ دو لاکھ کی کار چلی جاتی۔

انہیں امید تھی کہ وہ چاروں اپنے اپنے والدین سے پانچ پانچ ہزار لا کر بیس ہزار کا قرض ادا کر دیں گے لیکن قاسم کا باپ بیرون ملک کے دورے پر چلا گیا تھا۔ محمود کے باپ نے ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیا تھا کہ وہ آوارہ ہو گیا ہے ماہانہ دس ہزار روپے خرچ کرنے لگا ہے اور مزید پانچ ہزار لینے آیا ہے۔ اس طرح باقی دو دوست بھی ناکام رہے تھے وہ تھوڑی رقم ضرور لائے تھے لیکن دوسرے قرض خواہوں نے رقم چھین لی تھی۔ اس رات میں مسکن دوائیں کھا کر سو گیا تو ایک نے کہا "یہ کروڑ پتی باپ کا بیٹا ہے۔ اس کے پاس تھوڑی بہت رقم ضرور ہو گی۔"

انہوں نے میری جیب سے چابی نکال کر اٹیچی کھولی۔ اس کی تلاش لی۔ کپڑوں کے نیچے سے ستائیس ہزار روپے نکلے۔ ان کی تو عید ہو گئی۔ ابا نے مجھے دس ہزار دیئے تھے لیکن امی نے ان سے چھپا کر بیس ہزار روپے اٹیچی میں رکھ دیئے تھے۔ کل تیس ہزار میں سے میں نے تین ہزار خرچ کئے تھے باقی ان چاروں کے ہاتھ لگ گئے۔

انہوں نے اٹیچی کو پہلے کی طرح لاک کیا۔ چابی میری جیب میں رکھی۔ پھر وہ دوسرے کمرے میں آ گئے۔ قاسم نے کہا۔ "میں کل صبح ہی بیس ہزار ادا کر کے اپنی کار لے آؤں گا۔"

اسلم نے پوچھا "کل وہ اپنی اٹیچی کھولے گا تو کیا ہو گا؟"

قاسم نے کہا۔ "ہم سب اپنے اپنے کمرے سے ایک ایک قیمتی چیز غائب کر دیں اور سلمان کے کمرے سے اس کی اٹیچی کو غائب کیا جائے۔ اس طرح یہ تاثر دیا جائے کہ کوٹھی

میں ڈاکو آئے تھے۔"

ایک نے چٹکی بجا کر کہا۔ "فنٹاسٹک آئیڈیا ہے۔"

"یہ آئیڈیا کامیاب ہو جائے تو اس پاگل کو بھی کسی بہانے سے یہاں سے ٹرخا دینا چاہئے۔"

"یہ تو ہاسٹل میں جگہ ملنے سے پہلے نہیں جائے گا۔"

"اس کا باپ بھی جائے گا۔ ہم اس کے ساتھ کچھ ایسی الٹی سیدھی حرکتیں کریں گے کہ یہ بھاگنے پر مجبور ہو جائے گا۔"

دوسری صبح میری آنکھ پہلے کھلی۔ میں قدرے سکون محسوس کر رہا تھا۔ سوچا غسل کر کے لباس تبدیل کروں تب معلوم ہوا کہ اٹیچی غائب ہے۔ میں نے قاسم کے کمرے میں آ کر اسے جگایا اور اپنی اٹیچی کے متعلق پوچھا۔ اتنے میں محمود نے آ کر کہا "یار قاسم! میری الماری کھلی ہوئی ہے۔ میری سونے کی انگوٹھی، ٹائی پن اور چھ ہزار روپے غائب ہیں۔"

قاسم نے پوچھا "تم نے الماری کو لاک نہیں کیا تھا؟"

وہ بولا تم تو جانتے ہو۔ رات دو بجے تک سلمان کا ذہنی توازن بگڑا رہا۔ ہم اسے سنبھالتے رہے۔ جب یہ سو گیا تو ہم نے خوب پی لی۔ مدہوشی میں الماری لاک کرنا کیسے یاد رہتا ہے۔"

"بھئی یہ سلمان کہہ رہا ہے اس کی اٹیچی غائب ہے۔"

"اس کا مطلب ہے رات چور آئے تھے۔ تم اپنے کمرے کی تلاشی لو۔"

کمرے کی چیزیں دیکھنے پر معلوم ہوا وی سی آر چوری ہو گیا ہے۔ ریاض اور اسلم نے بتایا کہ نقد رقم، سونے کی چین اور گھڑی وغیرہ چوری ہو گئی ہیں۔ مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ میرے ساتھ وہ چاروں بھی لٹ گئے ہیں۔ میں نے کہا "پولیس کو انفارم کرنا چاہئے۔"

قاسم نے کہا "ہم سے پوچھا جائے گا کہ چور آئے تھے تو ہم پانچوں گہری نیند کیسے سو رہے تھے۔ کسی ایک کو تو آہٹ سن کر جاگنا چاہئے تھا۔ کیا ہم کہہ سکیں گے کہ ہم نے بہت زیادہ نشہ کیا تھا؟ یا سب کے سب خواب آور گولیاں کھا کر سو گئے تھے۔ پھر چوری کی رپورٹ سے ملتا کیا ہے؟ مال تو کبھی نہیں ملتا۔ کچھ بچا کھچا مل بھی جائے تو اس سے زیادہ تھانے پولیس کے چکر میں رقمیں خرچ ہوتی رہتی ہے۔ بات عدالت تک پہنچے تو پیشیاں بھگتنی پڑتی ہیں۔"

ان سب نے مل کر مجھے قائل کر دیا کہ پولیس کے چکر میں نہیں پڑنا چاہئے۔ قاسم نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ "میرے دوست! ہمیں اپنی چوری کا غم نہیں ہے۔ شرمندگی یہ ہے کہ تم مہمان بن کر آئے اور لٹ گئے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں کسی طرح بھی خون پسینہ ایک کر کے تمہارے ستائیس ہزار ادا کروں گا۔"

میں نے کہا "قاسم بھائی! ایسی باتیں نہ کرو۔ میں تم سے ایک پیسہ نہیں لوں گا۔ یہ

واردات ہم سب کے ساتھ ہوئی ہے۔ مجھے رقم کے جانے کا اتنا افسوس نہیں ہے۔ آج خط لکھوں گا یا پنڈ جاؤں گا تو رقم لے آؤں گا۔ مجھے تو یہ شرمندگی ہے کہ پچھلی رات میرے پاگل پن کے باعث تم لوگوں کو پریشانی ہوئی ہو"

"پریشانی اس لئے نہیں ہوئی کہ تم بوجھ ہو۔ ہاں تمہارے پاگل پن سے ہم پریشان ہوئے اور تشویش میں مبتلا ہو کر سوچنے لگے کہ اتنے پیارے دوست کو یہ کیا روگ لگ گیا ہے۔ یہ غم غلط کرنے کے لئے ہم نے زیادہ پی لی تھی۔"

محمود نے کہا "ہم تمہارا علاج کر کے رہیں گے۔ اگر تمہیں ہماری دوستی پر بھروسا نہیں ہے تو انکار کر دو۔ ورنہ ہم جیسا کہتے جائیں تم عمل کرتے جاؤ۔ پھر دیکھو گے کہ ہمیشہ نارمل رہا کرو گے۔"

قاسم اپنی کار واپس لے آیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کار گروی میں پھنسی ہوئی تھی۔ محمود نے قاسم کے کمرے سے وی سی آر لے جا کر دکاندار کو دیا تھا اور مزید دو ہزار دے کر نئے ماڈل کا دوسرا وی سی آر لے آیا تھا۔ مجھے تاثر دیا گیا کہ صرف تین ہزار ادا کر کے وہ قسطوں پر لایا گیا ہے۔

میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا تھا کہ اب وی سی آر پر فلمیں نہیں دیکھوں گا۔ دماغ قابو میں نہیں رہتا ہے۔ مجھے یہ بات یاد آتی تھی کہ میرے دادا کو بھی کسی عورت نے دیوانہ بنا کر پاگل خانے پہنچا دیا تھا۔ ایک ناقابلِ حصول حسینہ میری رگوں میں لہو کی طرح رواں دواں تھی اور میں اپنی رگیں کاٹ کر نہیں پھینک سکتا تھا۔

وی سی آر پر فلمیں نہ دیکھنے کے فیصلے پر قائم نہ رہ سکا۔ انہوں نے میرا علاج کرنے کے بہانے ایک چال چلی۔ شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ میں قاسم کے کمرے میں بیٹھا کہہ رہا تھا۔ "کل میں پنڈ جاؤں گا اور ای سے کچھ رقم لے آؤں گا۔"

اسی وقت باہر پورچ میں کار رکنے کی آواز آئی۔ قاسم نے مسکرا کر کہا "محمود آیا ہے اور تمہاری شاہدہ کو لایا ہے۔"

ایک دم سے میرے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "شاہدہ؟ یعنی میری کزن؟"

اسی وقت کمرے کے باہر چھم چھم کی دھیمی سی آواز سنائی دی۔ قاسم نے کہا "وہ تمہاری کزن ہے یا نہیں یہ میں نہیں جانتا۔ ہاں' محمود نے بتایا تھا کہ کسی شاہدہ کو لانے والا ہے۔"

دروازہ کھلا چھم چھم کی آواز واضح ہو گئی۔ میں نے سر گھما کر دیکھا۔ وہ کھڑی ہوئی تھی۔ چہرے پر دوپٹے کا نصف گھونگٹ تھا اس لئے صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں کی اُجلی' رنگت بتا رہی تھی کہ وہ بہت حسین ہے۔ تنگ پاجامے اور ململ کے کرتے میں اس کی صحت مندی دیکھ کر دل گواہی دے رہا تھا وہ شاہدہ ہے۔

محمود اس کا ہاتھ تھام کر کمرے کے دوسرے دروازے سے کاریڈور میں گیا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی لیکن دور تک اور دیر تک پازیب کی چھم چھم پکارتی رہی۔ پھر محمود نے واپس آ کر مجھ سے کہا۔ "میں نے اسے تمہارے کمرے میں پہنچا دیا ہے۔"

"میرے کمرے میں؟ میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے کپکپاتی ہوئی آواز میں پوچھا "لیکن وہ ...."

قاسم نے میرے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا "گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اپنے کمرے میں نہ جانا چاہو تو میرے بستر پر سو جانا۔ بھئی ریاض! فلم چلاؤ۔"

ریاض وی سی آر کے پاس گیا۔ محمود نے کہا "سلمان! تم نے بتایا تھا کہ جس رات بارش میں تمہاری کزن بھیگ رہی تھی' اس وقت اس نے ململ کا کرتا اور تنگ پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ آج بھی شاہدہ وہی لباس پہن کر آئی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "مگر یہ تو بتاؤ یہ شاہدہ کون ہے؟"

قاسم نے کہا۔ "یار! خود جا کر دیکھ لو۔ فلم شروع ہو گئی ہے۔ ہمیں دیکھنے دو۔"

میں اضطراب میں مبتلا ہو گیا۔ میں نہیں جانا چاہتا تھا مگر جا کر دیکھنا بھی چاہتا تھا۔ جانا پہچانا سا بدن کہہ رہا تھا "میں وہی ہوں۔ ہاں' میں وہی ہوں ...."

سامنے اسکرین پر رنگین اور سنگین نظارے تھے اور نظروں میں ململ سے جھلکتا بدن تھا۔ آنکھیں ادھر تھیں' دھیان ادھر تھا۔ پھر میں نے محسوس کیا۔ وہاں بیٹھا رہا تو پھٹ پڑوں گا۔ میں ایک دم سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سب نے مجھے نظر انداز کیا۔ کسی نے نہیں پوچھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ میرے اندر دھواں سا بھر رہا تھا۔ میں آگے بڑھتے ہوئے لڑکھڑایا۔ ریاض نے گرنے سے پہلے مجھے سنبھال لیا۔ قاسم نے کہا۔ "اسے کمرے میں پہنچا کر آ جاؤ۔"

سوچا جائے تو نشہ کسی چیز میں نہیں ہوتا۔ احساس میں ہوتا ہے۔ احساس کرنے والا ایک گھونٹ پی کر بہک جاتا ہے اور بے حس پینے والا پوری بوتل حلق سے اتار کر اپنے پیروں پر کھڑا رہتا ہے۔ نشہ اس کا کچھ نہیں بگاڑتا۔ میں وہی تھا جو ایک گھر میں رہ کر کزن کے وجود کا احساس نہیں کرتا تھا۔ جب اس نے احساس دلایا تو پھر یہی احساس بے لگام نشہ بن گیا۔ میں ریاض کے سہارے اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آیا۔ وہ پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ریاض مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔

اسے دیکھ کر میں دروازے سے لگ گیا۔ پھر فاتحانہ انداز میں بولا "تم میرے کمرے میں آنے سے انکار کرتی تھیں۔ مگر آج تمہیں آنا پڑا۔ اب حجاب کیسا؟ آنچل سرکاؤ۔ اپنی صورت دکھاؤ۔"

وہ ذرا کسمائی۔ بستر پر بیٹھے بیٹھے ذرا سرک کر دور ہو گئی۔ میں دروازے کے پاس سے آگے بڑھا۔ لڑکھڑاتا ہوا پلنگ کے پاس آیا۔ پھر گرتے گرتے سنبھل کر بستر کے سرے پر

اوندھے منہ گر پڑا۔ اس کا ایک پاؤں ذرا قریب تھا۔ بلب کی روشنی میں چاندی کی پازیب چمک رہی تھی۔ میں نے پازیب پر ہاتھ رکھا۔ اس وقت تاریکی چھا گئی۔ بجلی چلی گئی تھی۔

مجھے یوں لگا' اسے اندھیرے کی چادر میں چھپا کر مجھ سے چھین کر لے جایا جا رہا ہے۔

میرے ہاتھ سے اس کی پازیب نکل گئی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر بستر پر ٹٹولا۔ پازیب تھی نہ پاؤں تھا۔ پاؤں والی بھی نہیں تھی۔ میں نے چیخ کر آواز دی۔ "کزن! تم کہاں ہو۔ میرے پاس آؤ۔ آؤ' اب نہ جاؤ۔ میں تمہارے پیچھے بھاگتے بھاگتے تھک گیا ہوں۔ تمہارے پاس پہنچتے پہنچتے گر پڑا ہوں۔ مجھے سنبھال لو۔ کزن ...... کزن ......"

میں چیخ رہا تھا۔ اسے پورے بستر پر ٹٹول رہا تھا۔ وہ نہیں مل رہی تھی۔ نامرادی مجھے اندر سے جھنجوڑ رہی تھی۔ مجھے وہ رات یاد آئی جب اس نے طمانچہ مارا تھا۔ میں تاریک بستر پر اسے تلاش کرتے کرتے نیچے فرش پر گر پڑا۔ مجھے یاد آیا کہ ایک رات میں اسے بازوؤں میں گرفتار کرنا چاہتا تھا مگر پلنگ کے پائے سے ٹکرا کر زخمی ہو گیا تھا۔ اس تاریک کمرے میں یہ منظر بھی دکھائی دیا کہ وہ دونوں ہاتھوں سے قرآن مجید تھامے اسے سینے سے لگائے میرے کمرے میں آئی ہے۔ میں ایک دم سے پھٹ پڑا۔ "شاہے دا ......"

میں فرش پر سے اٹھ کر چکراتا ہوا ایک طرف گیا تو اندھیرے میں کزن سے ٹکراتے ہی ایک ہاتھ سے گرفت میں لیا۔ دوسرے ہاتھ کی مٹھی میں اس کی زلفیں آ گئیں۔ میں نے غصہ سے کچھ کہنے کے لئے زلفوں کو ایک جھٹکا دیا تو لانبی چوٹی اور پراندے سمیت وگ ہاتھ میں آ گئی۔ دھوکا ...... دھوکا ...... دھوکا۔ میرے دماغ کی رگیں پھٹنے والی تھیں۔

وہ آئی نہیں تھی۔ آیا تھا۔ وہ گرفت سے نکلنے کے لئے زور لگا رہا تھا۔ میں نے گریبان پکڑ کر کھینچا۔ اس کے بدن کا سانس لیتا ہوا ایک مصنوعی حصہ الگ ہو کر میرے ہاتھ میں رہ گیا۔ وہ تڑپ کر میری گرفت سے نکل گیا۔ اسی وقت کمرا روشن ہو گیا۔ بجلی کا آنا جانا محض قاسم وغیرہ کا ایک منصوبہ تھا۔ روشنی ہوتے ہی آنکھیں ذرا چندھیا سی گئیں۔ دھندلی نظر سے میں نے اسلم کو دیکھا وہ ململ کے کرتے اور تنگ پاجامے میں تھا اور دروازہ کھول کر کمرے سے باہر بھاگ رہا تھا۔ قاسم' ریاض اور محمود کمرے میں آ گئے تھے اور مجھ پر قہقہے لگا رہے تھے۔ میں نے ڈوبتے ہوئے ذہن سے انہیں دیکھا اور دم توڑتی ہوئی ہوشمندی سے اتنا سمجھا کہ میں پاگلوں کی طرح چیخ رہا ہوں اور اپنی مرضی کے خلاف بے اختیار دیوار سے ٹکریں مار رہا ہوں۔ اس کے بعد میں اپنے تمام ضروری ارمانوں کے ساتھ مر گیا۔

اسے موت ہی کہنا چاہئے کہ مجھے اپنے وجود کا پتا نہیں تھا۔ میرے والدین کہتے ہیں میں وحشت و جنون میں چیختا چلاتا اور دوڑتا بھاگتا تھا۔ مجھے زنجیروں سے باندھ کر رکھا جاتا تھا۔ ایسی بھی زندگی ہوتی ہے کہ ہمیں اپنی خبر نہیں ہوتی۔ آنکھیں کھلی رہتی ہیں مگر ہم دنیا کو دیکھ کر سمجھ نہیں پاتے۔ اپنے عزیزوں اور رشتے داروں کو پہچان نہیں پاتے۔ اپنی پیدا کرنے والی ماں کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ ممتا کے دودھ کا ایک چھینٹا بھی ہمیں ہوشمندی کی طرف نہیں لاتا۔

کیلنڈر کی تاریخیں بدل رہی تھیں۔ ایک ایک ماہ کے ورق الٹ رہے تھے۔ ڈاکٹر وغیرہ مجھے ہوشمندی کی طرف لانے کی کوششیں کر رہے تھے۔ انہوں نے کہہ دیا تھا۔ "جب تک یہ ہوش و حواس میں نہیں آئے گا' اس کا نفسیاتی تجزیہ اور علاج نہیں ہو سکے گا۔"

چھ ماہ بعد ایک صبح میں نے آنکھ کھولی تو یوں لگا ابھی پیدا ہوا ہوں۔ یہ دنیا نئی نئی سی لگی۔ نرس اور ڈاکٹر آئے' وہ بھی نئے انسان لگ رہے تھے۔ بستر سے منسلک رہنے والی زنجیروں سے میرے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ اس پر مجھے حیرانی نہیں ہوئی۔ ابھی مجھے یاد نہیں آیا تھا کہ کبھی دماغی توازن کھو بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔ "ہیلو' کیسے ہو؟"

"ٹھیک ہوں۔ تھینک یو ڈاکٹر! بائی دی وے' مجھے کیا ہوا تھا؟"

"یہ خود ہی بڑی سہولت سے آہستہ آہستہ سوچو۔ تم کون ہو اور تمہیں کیا ہوا تھا؟ آج سے تمہیں ہمارے ساتھ تعاون کرنا ہے۔"

اس نے وارڈ بوائز کو بلا کر زنجیریں کھولنے کا حکم دیا پھر کہا۔ "تم چھ ماہ سے انڈر ٹرٹمنٹ ہو۔ پچھلے ایک ماہ سے خاموش اور سنجیدہ ہو۔ اگرچہ بولتے نہیں تھے' ہماری باتیں نہیں سمجھتے تھے تاہم دوسروں کے لئے خطرناک نہیں رہے تھے۔ ایک ماہ کی اسٹڈی کے بعد یہ زنجیریں کھولی جا رہی ہیں۔"

میرے ہاتھ کھل گئے۔ نرس نے سرہانے کی میز کی طرف اشارہ کیا پھر کہا۔ "یہ گلاس میں دودھ ہے اور یہ گلوکوز' اسے کیسے استعمال کرو گے؟"

میں نے سوچتی ہوئی نظروں سے دودھ اور گلوکوز کو دیکھا۔ فوراً یاد آ گیا۔ میں نے تین

چمچ گلوکوز دودھ میں حل کیا۔ پھر اسے پینے لگا۔ ڈاکٹر نے کہا "شاباش! یہ کلپ بورڈ، قلم اور کاغذ ہیں۔ اسے پکڑو۔"

میں نے وہ چیزیں لے لیں۔ ڈاکٹر نے اپنی رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا "میں صرف پانچ منٹ دے رہا ہوں۔ ان پانچ منٹوں میں صرف اپنے متعلق لکھو۔ کوئی بات نہ سوچنا۔ لکھنے کے لئے کوئی پلاننگ نہ کرنا۔ جو بات دماغ میں آتی جائے اسے لکھتے چلے جاؤ۔ کم ان' اسٹارٹ رائٹنگ۔"

میں کلپ بورڈ پر جھک کر لکھنے لگا۔ ڈاکٹر نے پانچ منٹ کے بعد کہا۔ "اسٹاپ۔"

میں نے قلم روک لیا۔ اس نے وہ کاغذ لے کر نرس کو دیا پھر مجھ سے کہا۔ "تم جس ہستی کو زیادہ چاہتے ہو اس کے متعلق لکھو وقت وہی پانچ منٹ ہے۔ کم آن سٹارٹ۔

ڈاکٹر کی باتیں سنتے ہی میرے سامنے امی کا ممتا بھرا چہرا ابھرا تھا۔ میں بے اختیار ان کے متعلق لکھتا چلا گیا۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت تھی۔ میں ابھی پیدا ہوا تھا اور ایک نوزائیدہ بچہ اپنی ماں کو ہی سوچتا اور ماں کو ہی ڈھونڈتا ہے۔

پانچ منٹ کے بعد ڈاکٹر نے وہ صفحہ بھی لے لیا۔ اسی طرح اس نے پانچ منٹ کا وقت دے کر لکھوایا کہ مجھے کن چیزوں سے اور کن کرداروں سے محبت ہوتی ہے۔ مجھے کون سی باتیں ناگوار گزرتی ہیں اور شدید نفرت کے اسباب کیا ہوتے ہیں۔ ان امتحانات کے بعد میری امی اور ابا کو مجھ سے ملنے کی اجازت دی گئی۔ امی آتے ہی خوشی سے لپٹ کر رونے لگیں۔ ابا نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "بیٹے میں کبھی تم سے ناراض ہوا تھا۔ اسے بھول جاؤ۔ میں تم سے وہی پہلے جیسی محبت کرنے والا باپ ہوں۔ تم اپنے آپ کو سنبھالو۔ تمہارے اندر تھوڑا سا بھی غصہ' تھوڑی سی بھی نفرت ہے خواہ کسی کے لئے ہے تو اسے نکال کر پھینک دو۔ دنیا کی کوئی سی بھی خواہش کرو۔ میں اپنی بساط کے مطابق اسے پوری کروں گا۔"

اسی وقت چاچی اور چاچا آئے۔ چاچی نے میری بلائیں لیں۔ چاچا نے دعائیں دیں۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوئے تھے تب انہیں دیکھتے ہی کزن یاد آگئی تھی۔ میری نظریں بار بار دروازے کی طرف جا رہی تھیں۔ شاید وہ اپنے والدین کے پیچھے آنے والی ہو لیکن وہ نہیں آئی تھی۔ مجھے غصہ نہیں آیا۔ کوئی جوش یا جذبہ پیدا نہیں ہوا۔ صرف مایوسی ہوئی۔

دوسرے دن ڈاکٹر نے کہا "آج وقت کی پابندی نہیں ہے۔ ابھی لکھنا شروع کرو اور جب تک لکھ سکتے ہو لکھتے چلے جاؤ۔"

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ جو جی میں آیا' وہ لکھتا چلا گیا۔ ڈاکٹر اسپتال کے دوسرے مریضوں کو دیکھنے گیا تھا' واپس آیا تو میرے تحریر شدہ کاغذات کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ایک اسٹنٹ لیڈی ڈاکٹر وہ تمام کاغذات ترتیب سے ایک فائل میں رکھ کر لے گئی۔

دوسرے دن ڈاکٹر نے میرے ابا سے کہا "تمہارا بیٹا کسی کزن سے بہت زیادہ اٹیچ ہے۔ کیا

آپ اس سلسلے میں کچھ روشنی ڈالیں گے۔"

وہ تذبذب میں پڑ گئے۔ اپنے بھائی کی بیٹی کو اس معاملے میں لانا نہیں چاہتے تھے۔ ڈاکٹر نے کہا "آپ کوئی جواب دینے سے پہلے یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ آپ کا ایک بھی غلط جواب آپ کے بیٹے کی دماغی حالت کے لئے نقصان دہ ہو گا۔"

انہوں نے میری سلامتی کی خاطر ڈاکٹر کو ابتدا سے آخر تک وہ تمام باتیں بتائیں جو وہ جانتے تھے۔ پھر بھی بتانے کے لئے بہت کچھ رہ گیا تھا اور وہ بہت کچھ صرف شاہدہ جانتی تھی یا میں جانتا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا "آپ کہتے ہیں وہ پونے دو برس تک چچا کے گھر میں رہا۔ اسے کزن سے اور کزن کو اس سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ پھر اچانک وہ کزن اس کے خلاف کیوں ہو گئی؟ آپ کے بیٹے نے اس پر جھوٹا الزام کیوں لگایا؟"

ابا نے کہا۔ "بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہم اپنے بچوں سے نہیں کرتے۔ ہمارے اندازے کے مطابق ان کے درمیان ایسا شرمناک اختلاف پیدا ہوا ہے جو میرے بیٹے پر یہ مصیبتیں لے آیا ہے۔"

"بات کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی ہے۔ اگر آپ تمام بزرگ حضرات مل کر کسی طرح اختلافات دور کریں تو علاج آسان ہو جائے گا۔"

ابا نے یہ باتیں امی کو سمجھائیں۔ امی نے اس لئے سمجھ لیا کہ وہ میری سلامتی کے لئے کچھ بھی کر سکتی تھیں۔ پھران کی بہن کی بیٹی بیاہ کر دوسری جگہ چلی گئی تھی۔ وہ مجھ سے تنہائی میں بولیں۔ "میں تمہیں ہنستے بولتے دیکھنا چاہتی ہوں۔ سچ سچ بتاؤ کیا شاہدہ کو اپنی دلہن بنانا چاہتے ہو؟"

زندگی اور موت کی درمیانی جگہ اسپتال ہے۔ یہاں آنے والا موت کی طرف بھی جا سکتا ہے۔ یہاں بیٹھ کر میں کہہ سکتا تھا کہ میری آخری خواہش صرف شاہدہ ہے۔ میں نے امی کے سامنے ہاں کے انداز میں سرہلا دیا۔

پھر بزرگوں کے درمیان کھچڑی پکنے لگی۔ چاچی اور چاچا اگرچہ مجھے دعائیں دینے آئے تھے۔ تاہم مجھ سے بدظن تھے۔ رشتے داری میں رسمی طور پر بھی دعائیں دی جاتی ہیں۔ اختلافات کے باوجود دکھ درد میں خیر خیریت پوچھ لی جاتی ہے لیکن کسی بھی عزت دار اور غیرت مند لڑکی کے ماں باپ یہ برداشت نہیں کرتے کہ اس کے اجلے دامن پر کوئی دھبا لگا کر چلا جائے۔ میں بڑے بھائی کا بیٹا تھا اس لئے وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے تھے اور اپنے ہاں میرا داخلہ ممنوع کر دیا تھا۔

جب ابا نے میرے لئے پھر سے شاہدہ کو مانگا تو چاچا ہتھے سے اکھڑ گئے۔ "بھائی جان! آپ آئندہ میری بیٹی کا نام اپنے بیٹے کے نام کے ساتھ نہ لیں۔ ورنہ آپ سے بھی رشتہ ٹوٹ جائے گا۔"

امی نے اپنا دامن پھیلا کر کہا "پچھلی غلطیوں پر خاک ڈالنے کی کوئی صورت نکالو۔ ہم

عمر میں اور رشتے میں تم سے بڑے ہیں پھر بھی تمہارے آگے جھک رہے ہیں۔"

"بھائی، آپ جھکتے جھکتے ٹوٹ جائیں گی۔ پھر بھی وہ ذلیل اور کم ظرف میرا داماد نہیں بنے گا۔"

ابا نے پوچھا "ایسی کیا قیامت ہو گئی ہے کہ معافی اور توبہ کا کوئی دروازہ ہی نہیں کھل سکتا؟"

چاچا نے کہا "آپ دیکھنا اور سننا ہی چاہتے ہیں تو ابھی دکھاتا اور سناتا ہوں۔"

انہوں نے اپنی الماری کھول کر کچھ کاغذات نکالے۔ پھر ایک ایک کاغذ میرے ابا کے منہ پر پھینکتے ہوئے کہا "یہ دیکھیں اور یہ دیکھیں اور یہ پڑھیں۔ آپ کے بیٹے کے دوستوں نے ڈاک کے ذریعے میری بیٹی کو یہ خط لکھے ہیں۔ یہ ایسے خطوط ہیں جنہیں فوراً جلا دینا چاہئے لیکن میں نے ثبوت کے طور پر رکھا ہے کہ آپ کا وہ کم ظرف بیٹا کیسی کیسی محفلوں میں میری بیٹی کی بے حیائی کی باتیں کرتا ہے۔"

ابا نے وہ خطوط پڑھ کر ندامت سے سر جھکا لیا۔ امی نے کہا۔ "ہمارے بیٹے نے کمینگی کی انتہا کر دی ہے۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ شاہدہ ہمارے خاندان کی غیرت ہے۔ ڈاکٹر نے کہا کہ وہ نارمل ہو رہا ہے۔ اسے غصہ دلانے اور صدمہ پہنچانے والی باتیں نہ کی جائیں۔ میں اسے یہ خطوط بھی نہیں دکھا سکتا۔ اسے جوتے بھی نہیں مار سکتا۔ میں کیا کروں۔ کیا میں پاگل ہو جاؤں؟"

"خدا نہ کرے کہ آپ کے ساتھ کچھ ایسا ہو۔ یہ تو خاندانی دشمنی کی بنیاد پڑ گئی ہے۔ آپ دونوں بھائیوں نے ایسے نازک موقع پر صبر اور دانشمندی سے کام نہ لیا تو ایک طرف ہمارا بیٹا پھر سے پاگل ہو جائے گا اور شادہ مفت میں بدنام ہوتی رہے گی۔"

"آپ ہماری شادہ کی فکر نہ کریں۔ اس کے نصیب میں جو ہو گا وہ بھگت لے گی۔ آپ مہربانی کر کے گفتگو کا موضوع بدل دیں یا یہاں سے چلے جائیں۔"

میں نے اپنے والدین کو کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ مجھ پر غصہ نہیں دکھا سکتے تھے۔ میرے پاس آتے تھے اور جھوٹی تسلیاں دیتے تھے کہ ابھی شاہدہ کو رشتے کے لئے راضی کیا جا رہا ہے۔ پھر چاچی اور چاچا یہ کہتے ہیں کہ سلمان جب دماغی طور پر بالکل نارمل ہو جائے گا تو رشتے کی بات آگے بڑھائی جائے گی۔ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ پر سکون اور نارمل رکھنے کے لئے ایسی باتیں کرتے رہتے تھے۔

مزید چھ ماہ گزر گئے یعنی ایک برس تک جاری رہنے والے علاج سے میں بالکل نارمل اور صحت مند ہو گیا تھا۔ ادھر چاچا کسی دوسری جگہ شاہدہ کا رشتہ طے کر رہے تھے۔ ابا نے کہا۔ "دیکھو، میرے بیٹے سے دشمنی نہ کرو۔ اسے نئی زندگی ملی ہے، مجھ سے میرا بیٹا نہ چھینو۔ شاہدہ صرف میرے گھر آئے گی۔"

"بھائی جان! یہ میری زندگی میں نہیں ہو گا۔"

"پھر میرے بیٹے کی زندگی میں شاہدہ کسی اور کی دلہن نہیں بن سکے گی۔"

"کیا آپ دھمکی دے رہے ہیں؟"

"آج دھمکی ہے کل دھماکا ہو گا۔"

"اچھی بات ہے۔ آج سے بڑے بھائی کا احترام ختم سمجھو کوئی دھماکا ہوا تو منہ توڑ جواب دوں گا۔"

چاچا دوسرے دن شاہدہ کے ہونے والی سسرال گئے تو وہاں چند بزرگوں نے کہا۔ "بھائی صاحب! آپ کچھ زیادہ ہی چالاک بن رہے ہیں۔ کیا یہ بتا سکتے ہیں کہ آپ بیٹی کی شادی اپنا خاندان چھوڑ کر ہمارے خاندان میں کیوں کر رہے ہیں؟"

چاچا نے کہا۔ "اس لئے کہ آپ کا لڑکا ہمیں پسند ہے۔"

"لیکن آپ کی لڑکی ہمیں پسند نہیں ہے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ نے ہم میں کیا عیب دیکھا ہے؟"

"کوئی عیب ہے تب ہی آپ کے خاندان میں اسے کسی نے بہو نہیں بنایا ہے۔ اب ہماری زبان نہ کھلواؤ۔ ہماری بھی بیٹیاں ہیں۔"

چاچا وہاں سے سر جھکا کر چلے آئے۔ ایک نیک سیرت بیٹی کی بدنامی سے دل کٹ رہا تھا۔ انہوں نے خاندان کے بزرگوں کو بلایا اور کہا "بھائی جان اس خاندان کی ایک عزت دار بیٹی کو دوسرے خاندانوں میں جا کر بدنام کر رہے ہیں۔ ان کی یہ حرکت صرف میرے لئے نہیں آپ سب کے لئے بھی ندامت کا باعث ہے۔"

ایک بزرگ نے کہا "درست کہتے ہو۔ اکثر یہی ہوتا ہے کہ بہنوں اور بیٹیوں کی بدنامیوں سے اونچے خاندانوں کی عظمت اور وقار کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ دانشمندی یہی ہے کہ شاہدہ کی بدنامی کو یہیں روک دیا جائے اور اپنے ہی خاندان میں اس کی شادی کر دی جائے۔"

دوسرے بزرگ نے کہا۔ "وہ سلمان کے ساتھ بدنام ہو رہی ہے۔ سلمان ہی اس کے سر کی چادر بن سکتا ہے اور کی پارسائی کا بھرم رکھ سکتا ہے۔"

چاچا نے کہا "میں بھائی جان کی نادانی اور زیادتیاں بیان کر رہا ہوں اور آپ لوگ ان کی ہی حمایت میں بول رہے ہیں؟"

ایک اور بزرگ نے کہا "اگر ہمیں جہاں دیدہ سمجھ کر فیصلہ کرنے بلایا ہے تو فیصلہ یہی ہے دوسرے خاندانوں میں بیٹی کا رشتہ کرنے اور بدنامی کو دور تک پھیلانے سے صرف تمہاری نہیں ہم سب کی ذلت اور رسوائی ہے۔"

ایک اور بزرگ نے کہا "تمہیں اپنے بھائی جان کا احسان ماننا چاہئے۔ کہ شادی سے پہلے رسوا ہونے والی کو وہ بہو بنا رہا ہے۔ اس شادی کے بعد کوئی تمہاری بیٹی کی طرف انگلی اٹھانے کی بھی جرات نہیں کرے گا۔"

وہاں بیٹھے ہوئے سب سے معمر بزرگ نے کہا "خاندان کے تمام بزرگوں نے متفقہ فیصلہ سنا دیا ہے۔ اگر تم نے فیصلہ تسلیم نہ کیا تو ہم دیکھیں گے کہ بیٹی کا بیاہ کہاں کرو گے۔ ہمارے جیتے جی شاہدہ خاندان پر کیچڑ اچھالنے کے لئے دوسرے گھر نہیں جائے گی۔"

چاچا وہاں سے سر جھکا کر چاچی کے پاس آئے۔ ان کے پیچھے کھڑی ہوئی شاہدہ نے کہا "ابا! آپ دونوں سگے بھائی ہیں۔ آپ کی بدقسمتی یہ ہے کہ آپ بیٹی کے باپ ہیں۔ آپ کو تو ہارنا ہی پڑے گا۔"

چاچا راضی ہو گئے۔ امی نے آکر مجھے خوشخبری سنائی۔ ڈاکٹر نے سنا تو اس نے مبارکباد دی۔ ابا نے کہا "آپ کے بیٹے کا یہی ایک علاج تھا۔ آپ لوگ دانشمندی کا ثبوت دے رہے ہیں۔"

ابا اس معاملے میں دیر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اگلے جمعے کو برات لے کر بھائی کے گھر پہنچ گئے۔ چاچا نے کہا تھا' شادی کی رات شادہ رخصت ہو کر میلوں دور پنڈ والی حویلی میں نہیں جائے گی۔ دلہا دلہن اسی کوٹھی میں رہیں گے۔ دوسری صبح رخصتی ہو گی۔ اور شاہدہ نے اپنی ماں سے کہا تھا۔ نکاح کے بعد وہ میرے ساتھ تنہا اس کوٹھی میں رہے گا۔ تمام براتی اور میکے والے دوسری کوٹھی میں رات گزاریں گے۔ یوں بھی براتی تعداد میں صرف پندرہ تھے۔ چونکہ ایک ہی خاندان تھا اس لئے وہ براتی بھی تھے اور شاہدہ کے میکے والے بھی۔ انہوں نے اسی محلے میں ایک دن اور ایک رات کے لئے کوٹھی حاصل کرلی تھی۔

نکاح پڑھاتے وقت بارش ہونے لگی تھی۔ اگر وہ شادی اطمینان اور سہولت سے ہوتی تو بارش کے موسم میں کبھی نہ ہوتی مگر سچائی کی آنکھ سے دیکھا جائے تو وہ زبردستی کی شادی محض میرے علاج کے لئے ہو رہی تھی۔ اس لئے کسی بھی موسم میں اور کسی حالت میں ہو سکتی تھی لہٰذا وہ ہو رہی تھی۔

میں بہت خوش تھا۔ میری زندگی کے اندھیروں میں آسیب بن کر آنے والی حقیقت بن کر آ رہی تھی۔ نکاح کے بعد کھانے کا انتظام دوسری کوٹھی میں تھا۔ چند عورتوں نے میکے میں ہونے والی دلہا دلہن کی رسومات ادا کیں۔ پھر وہ دلہن کو اس کمرے میں لے گئیں جہاں کبھی میں رہا کرتا تھا۔ پھر وہ واپس آئیں۔ امی اور چاچی نے مجھے دعائیں دیں۔ میں ان کے ساتھ کوٹھی کے باہر برآمدے تک آیا۔ جب وہ دوسری کوٹھی کی طرف جانے لگیں تو پھر بارش ہونے لگی تھی۔ میں سوچا انہیں رک جانے کو کہوں لیکن زبان نہیں کھلی۔ آج یہاں کسی کی موجودگی گوارہ نہیں تھی۔

وہ نظروں سے اوجھل ہو گئیں تو میں برآمدے سے گزر کر اندر آیا۔ بیرونی دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ پھر راہداری میں چلتا ہوا اپنے کمرے کے دروازے پر آگیا۔ میرے دل کی دھڑکنیں کچھ پاگل ہو رہی تھیں۔ میں نے آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر آتے ہوئے بستر کی طرف دیکھا تو وہ نہیں تھی۔ دلہن کی سیج ہونی تھی۔

میرے اندر بے چینی سی پھڑپھڑانے لگی۔ وہ ہاتھ آتے آتے نکل جاتی تھی۔ میں نے آواز دی۔ "کزن!"

باتھ روم کی طرف دیکھا۔ اس کا دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا اور اندر سے واش بیسن میں پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے ذرا اطمینان کی سانس لی پھر باتھ روم کے قریب آکر کہا۔ "کزن! خیریت تو ہے۔ تم نے دروازہ کھلا رکھا ہے اس لئے پوچھ رہا ہوں۔ کیا مدد کے لئے آؤں؟"

اندر خاموشی تھی۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا "بھئی مذاق کر رہا تھا۔ اندر نہیں آؤں گا۔ یہاں انتظار کر رہا ہوں۔"

میں مستی میں جھومتا ہوا بستر پر آکر چاروں شانے چت ہو گیا۔ اس بستر پر میں پونے دو برس تک تنہا سوتا رہا تھا اور یہاں کزن کو بلانے میں ناکام ہوتا رہا تھا۔ آج اسی کے لیے بستر پر پھولوں کی پتیاں بچھی ہوئی تھیں۔ مجھے دستک سنائی دی۔ میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ دستک نہیں تھی۔ کھٹکا سا ہوا تھا۔ کوٹھی کے تمام دروازے اندر سے بند تھے پھر راہداری میں کون ہو سکتا تھا؟"

میں نے بستر سے اٹھ کر دروازے کے پاس آکر پوچھا "کون ہے؟"

جواب نہیں ملا۔ میں نے اندر کی چٹخنی گرائی پھر دروازے کو کھولنا چاہا تو وہ نہیں کھلا۔ میں نے زور زور سے جھٹکا دیا۔ پتا چلا وہ باہر سے بند ہے۔ میں ابھی اس دروازے سے اندر آیا تھا۔ اسے باہر کی طرف سے کھلا ہونا چاہئے تھا۔ پھر یہ کیسے بند ہو گیا۔ میں نے چیخ کر پوچھا۔ "باہر........ کون ہے؟ کس نے دروازہ بند کیا ہے؟"

جواب میں بجلی کی زوردار کڑک سنائی دی۔ میں وہاں سے پلٹ کر تیزی سے چلتا ہوا باتھ روم کے پاس آیا۔ پھر دروازے کو کھول دیا۔ واش بیسن کا نلکا کھلا ہوا تھا اور پانی بیسن میں گر رہا تھا۔ میں نے اندر آکر دیکھا' وہ نہیں تھی۔ میں نے چیخ کر آواز دی۔ "شاہدہ!"

جواب میں بادل گرجنے لگے۔ جب گرجنے کی آواز کچھ کم ہوئی تو دستک سنائی دی۔ میں باتھ روم سے نکل کر کمرے کے بند دروازے کی طرف جانے لگا۔ پھر دستک سن کر رک گیا۔ گھوم کر کھڑکی کی سمت دیکھا۔ پھر ایک بار وہاں دستک ہوئی۔ میں نے آگے بڑھ کر صحن میں کھلنے والی کھڑکی کے پٹ کھول دیے۔

تیز ہوا کا جھونکا آیا۔ صحن میں موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ وہ تنگ پاجامے اور ململ کے کرتے میں بھیگ رہی تھی۔ اس کے بدن پر سہاگ کا سرخ جوڑا نہیں تھا۔ میں اسے سیج پر چاہتا تھا' وہ صحن میں تھی۔ بھیگنے کا عجب سماں پیش کر رہی تھی۔ احساس میں گدگدی پیدا کر رہی تھی۔ آج سے ٹھیک ایک برس پہلے اسی بارش میں اسی صحن میں اس کا یہی نظارہ تھا۔ اس وقت چاچی اور چاچا کی بیداری کے خوف سے صحن میں نہیں گیا تھا۔ آج بھی نہیں جا سکتا تھا اس نے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔

میں نے بے چین ہو کر کہا۔ "آج میں صحن میں آ سکتا ہوں' دروازہ کھولو۔"

وہ بولی "تم نے ایسی دلہن دیکھی یا سنی ہے جو پہلی رات سیج پر نہ ہو صحن کی بارش میں ہو؟"

"واقعی دیکھی نہ سنی۔ دروازہ کھولو۔ ہم دلہا دلہن یہ رات بارش میں منائیں گے۔"

وہ آنگن میں کبھی ادھر جا رہی تھی۔ کبھی ادھر آ رہی تھی۔ آنے جانے میں بدن لہریں لیتا تھا۔ زلفوں سے پانی مسلسل ٹپک رہا تھا اور گوری جلد پر پھسل رہا تھا۔ وہ پھسل کر صحن کے چکنے فرش پر ذرا دور تک گئی۔ فرش کے پانی میں لیٹی ہوئی جل پری لگ رہی تھی۔ ایک بھرپور انگڑائی لیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "میں تمہاری دلہن ہوتی تو سیج پر ہوتی۔ ایک نا محرم ہوں۔ اسی لئے ہمارے درمیان بند دروازے کی دیوار ہے۔"

"یہ کیا بکواس ہے۔ تم نامحرم نہیں ہو میری منکوحہ ہو۔ ہمارا نکاح پڑھایا گیا ہے۔"

"تم نے اور تمہارے باپ نے مجھے ہر پہلو سے گھیر کر بدنامی کے عذاب میں مبتلا کر کے اسی طرح منکوحہ کے بستر پہنچانا چاہا ہے جس طرح چند بدمعاش مجبور لڑکی کو زبردستی ہوس کے بستر پر لاتے ہیں۔"

بجلی کڑکتی ہوئی' ہاں کہتی ہوئی آسمان کے ایک طرف سے دوسری طرف چلی گئی۔

اس نے پوچھا۔ "بولو۔ کسی کو مجبور کر کے نکاح قبول کرانے سے نامحرم' محرم ہو جاتی ہے۔ یہ کس مذہب میں ہے کہ جب تھپڑ کھا کر بھی کسی کو بستر پر نہ لا سکو' زخم کھا کر بھی ایک شریف زادی کو مجبور نہ کر سکو .... تنہائی میں کلام پاک کو درمیان دیکھ کر شیطانی ارادے میں کامیاب نہ ہو سکو تو سماج اور برادری کے ٹھیکیداروں سے آبر ولوٹنے کا نکاح نامہ حاصل کر لو۔ کل میری لاش دیکھ کر تمہیں اور تمہارے باپ کو معلوم ہوگا کہ ایسے نکاح نہیں ہوتا بلکہ کسی بے بس کے جذبات کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔"

بادل گرجتے گئے۔ تائید میں ہاں ہاں کہتے گئے۔

وہ بول رہی تھی مگر بہت کم سنائی دے رہی تھی۔ جب برق سر صحن لہراتی ہو تو صرف نظارے دکھائی دیتے ہیں۔ میں نے کھڑکی کی جالیوں سے دونوں بازو اس کی طرف بڑھائے۔ گڑگڑا کر کہا "مجھے آنے دو۔ میرے دماغ میں جہنم دہک رہا ہے۔ میں کھڑکی توڑ دوں گا۔ اپنا سر پھوڑ لوں گا۔"

"اگر تمہارے دل میں خدا کا خوف ہوتا تو میں دروازہ کھول کر تمہارے پاس آ جاتی مگر ایک بے دین اور بے ایمان کے پاس نہیں آؤں گی۔ تم نے مقدس کتاب کا احترام نہیں کیا۔ ایمان والے ہوتے تو دنیا سے کہتے' تمہاری کزن کلام الٰہی کے سائے میں باوضو آئی اور باوضو گئی۔ اگر صرف میری توہین ہوتی تو میں برداشت کر لیتی لیکن تم نے کلام الٰہی کی نفی کی ہے۔ تمہیں اس کی سزا ضرور ملے گی۔"

میں نے گرجتے ہوئے کھڑکی کی آہنی جالیوں پر سر مارتے ہوئے کہا "دروازہ کھولو۔

دروازہ کھولو۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تم مجھے پاگل بنا رہی ہو۔ میں پاگل نہیں بن سکتا۔ میں پاگل نہیں ہوں۔"

میری پیشانی آہنی جالیوں سے لہولہان ہو رہی تھی۔ اس نے کہا تم پاگل ہو "تم پاگل رہو گے۔ تم نے مجھے بدکار ثابت کیا۔ میں تمہیں پاگل ثابت کروں گی۔ تم میرا یہ بدن کبھی حاصل نہیں کر سکو گے۔"

میں نے حلق پھاڑ کر پوچھا "تم کب تک بچتی رہو گی۔ یہ دروازہ کب تک بند رہے گا؟"

اس نے گریبان سے ایک چھوٹی سی شیشی نکالی پھر کہا "اگر ہمارا نکاح جائز ہے تو پھر بیوی کے مرتے ہی شوہر نامحرم ہو جاتا ہے۔ پھر مرحومہ کو چھونا تو دور کی بات ہے اس کی صورت بھی دیکھنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ صبح جب دروازہ کھلے گا تو دنیا والے موجود رہیں گے۔ ان کی موجودگی میں تم مجھے ہاتھ نہیں لگا سکو گے۔"

اس نے شیشی کھول کر منہ سے لگا لی۔ میں آہنی جالیوں کو جھنجوڑنے لگا۔ سر ٹکرانے لگا۔ وہ تمام زہر حلق سے اتارنے کے بعد زور سے چیخ کر بولی۔

سوال: "چچا کی بیٹی کو کیا کہتے ہیں؟"

جواب: "بچپن میں بہن اور جوانی میں کزن کہتے ہیں۔"

اور کزن نامحرم ہوتی ہے۔ میں کل بھی ناقابل حصول تھی۔ مرنے کے بعد بھی رہوں گی۔"

وہ پانی سے بھرے ہوئے صحن کے فرش پر گر پڑی۔ میں دوڑتا ہوا دروازے کے پاس آیا۔ اسے جھنجوڑنے لگا۔ وہ کھل نہیں سکتا تھا۔ اسے ٹکریں مارنے لگا۔ وہ ٹوٹ نہیں سکتا تھا۔ میں فرش پر پچھاڑیں کھانے لگا مگر مر نہیں سکتا تھا۔ نہ یہ ہو سکتا تھا نہ وہ ہو سکتا تھا۔ میں نے آخری بار کزن کو پکارنے کے لئے چیخ ماری پھر بے ہوش ہو گیا۔

پتا نہیں کتنے مہینے کتنے برس گزر گئے ہیں۔ میں زندہ ہوں مگر زندوں میں نہیں ہوں۔ کبھی نارمل رہتا ہوں تو یہ دنیا سمجھ میں آتی ہے کبھی ایب نارمل ہوتا ہوں تو ایک عالم نامعلوم میں رہتا ہوں۔ اور قبر کو بھی تو عالم نامعلوم کہا جاتا ہے۔ یوں میرے قبر میں آنے جانے کا سلسلہ جاری ہے۔

ختم شد